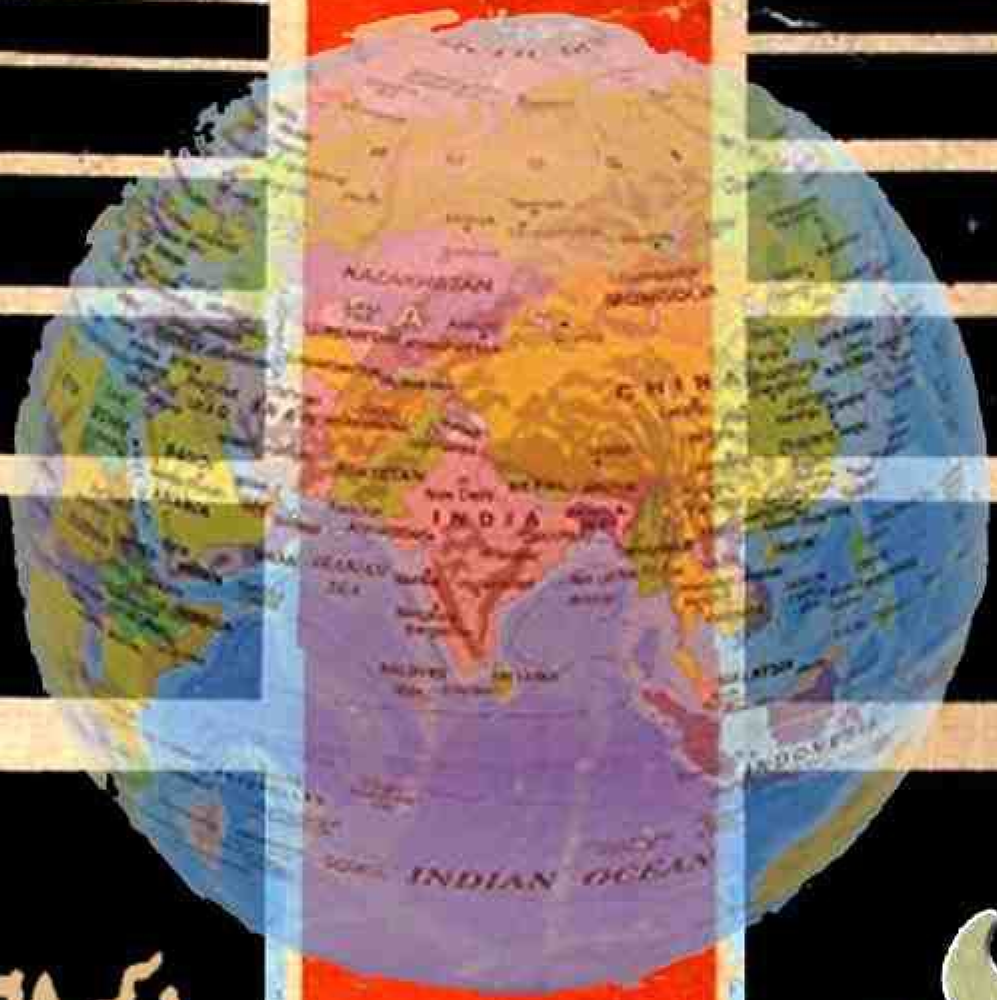

اُردو ڈائجسٹ

شبستان

نئی دہلی

دسمبر ۱۹۶۸

اشاعت کا دوسرا سال
بارھواں شمارہ

ایک کاپی کی قیمت:
۱ روپیہ پچاس پیسے
سال بھر کے لئے:
بیس روپے

[illegible] تین روپے کا سالنامہ
مفت دیا جاتا ہے، ہر شمارہ رجسٹری سے ہمارے
خرچ پر بھیجا جاتا ہے، تاکہ راستہ
میں چوری نہ ہو سکے

نگراں:
یوسف دہلوی
مدیران:
یونس دہلوی
ادریس دہلوی
الیاس دہلوی

صدر دفاتر: آصف علی روڈ، نئی دہلی
فون: ۲۷۲۰۶۶، ۲۷۲۰۶۷، ۲۷۲۰۶۸
دیگر دفاتر: بمبئی، کلکتہ اور مدراس

چاند ستارے

اداریہ		
اپنا صفحہ	مدیران	۶
انٹرویو		
سفیر شرق اردن ہز ایکسی لینسی مسٹر کمال الحمود	ملاقاتی	۷
خصوصی مضمون		
عربوں کو ویت نام سے سبق لینا چاہئے	سلامت علی مہدی	۱۶
سیروسیاحت		
میکسیکو	ڈبلیو ای گیرٹ	۱۹
حادثاتِ عالم		
میں موت کی وادی میں گھوم کر آیا ہوں	علی رضا طاہری	۵۸
ایٹمی آبدوز سمندر کی تہ میں غبارے کی طرح پھٹ گئی	جیمس ایچ ویکلین	[illegible]۴
جنگ وجدل		
دشمن کی تلاش	الون لنک	۳۴
تاریخ		
صلاح الدین کا قلعہ	مطلوب احمد	۳۸
یہ امریکی تہذیب دفن ہو گئی تھی	جوزف برکلے	۴۲
دلچسپ وعجیب		
ہاں میں مرنا چاہتی تھی	ماریا جولنس	۵۱
دستخطوں کی قیمت	سید بادشاہ حسین	۸۳
جب تیل میں آگ لگ جاتی ہے	محمد شاہد	۱۰۴
حالاتِ حاضرہ		
مسجد عمرؓ کو بچاؤ	محمد اسلام	۷۰
ناقابلِ یقین		
انقلابات ہیں زمانے کے	شاہد عظیم	۲۰
وہ ۶۲ سال تک اپنے وطن کے لئے لڑتا رہا	جینفر مارلے	۶

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

اسرار و ہیبت

بھوت کا سایہ	فاروق پراچہ	۱۱۲

جرم و سزا

عیّاشی کے لئے ماں باپ کا قتل	ٹم ہارلے	۱۰۸

شکاریات

زخمی ناگ شیر سے کم خطرناک نہیں ہوتا ہے	رابرٹ نیوس	۷۸

شعر و ادب

نظیر اکبر آبادی	م۔ رحیم	۸۷
غزل	مولانا شبلی نعمانی	۹۹
غزل	نوح ناروی	۱۲۸

طب و سائنس

پھلوں کا بادشاہ	حکیم محمد ارشد	۹۴
اب مصنوعی سیارے موسم کی چوکیداری کرتے ہیں	محمد علی چراغ	۱۰۰

غیر ملکی ادب

باسی ڈبل روٹی	او ہنری	۹۱

نفسیات

آپ کا دماغ آپ کو مریض بناتا ہے	کیتھرین الن	۱۱۶

شخصیات

البرٹ آئین اسٹائین	سید رفیع احمد	۹۶

تلخیص

میں نے جاسوس سے محبت کی	الینز فلپے	۱۲۹

★

تلخیص کار: سلامت علی مہدی　حسن کار: جگدیش بیج، ضیا اور غیاث　مشیر طباعت جمیل الرحمٰن
طابع و ناشر: محمد یونس دہلوی　مطبوعہ: درگا آرٹ پریس، دہلی　سرورق: رین بو پرنٹرز بلی ماران، دہلی
مالکان: شمع میگزین، نئی دہلی مقام اشاعت: ۱۲/۱۳، آصف علی روڈ، نئی دہلی

شبستاں میں شائع ہونے والے تمام مضامین دوسرے رسائل و اخبارات میں نقل کئے جا سکتے ہیں ــــ لیکن شبستاں اردو ڈائجسٹ نئی دہلی کا حوالہ دینا ضروری ہے

www.taemeernews.com

اپنا صفحہ

۱۹۶۸ ختم ہو رہا ہے ــــــ

اگلے ماہ ساری دنیا نئے سال کا استقبال کرے گی۔ صدیوں سے یہی ہو رہا ہے۔ ہم گزرے ہوئے وقت کا ماتم کرتے رہتے ہیں اور آنے والے وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں ہمیں سب سے زیادہ پیار وقت سے ہے جو اس کائنات کی سب سے بے نیاز شئے ہے۔ جو کبھی لوٹ کر نہیں آتا، جو کبھی پلٹ کر نہیں دیکھتا، جو ایک بے رحم سیلاب کی طرح بہتا رہتا ہے، رکے بغیر، ٹھہرے بغیر ــــــ

ہماری زندگی کا ہر نیا دن نئے افکار سے شروع ہوتا ہے۔ نئی نئی تمناؤں کو جنم دیتا ہوا، نئی نئی امیدوں کی طرف دیکھتا ہوا ــــــ اور پھر سورج ڈوبنے کے ساتھ ہی ہمارا یہ دن اپنی تمام تمناؤں، امیدوں اور جولانیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔

بالکل اسی طرح ــــــ جب پرانا سال ختم ہونے لگتا ہے اور نیا سال شروع ہونے والا ہوتا ہے تو ہم نئے نئے منصوبے بناتے ہیں، نئے نئے خیالوں کی دنیا بسانے کے خواب دیکھنے لگتے ہیں اور ماضی کا جائزہ لئے بغیر مستقبل کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں ــــــ یقیناً یہ ہماری خود فریبی ہے۔ ہم نے وقت کو تاریخوں اور مہینوں میں قید کر کے خود اپنے ساتھ فریب کیا ہے۔ ہم وقت پرست ہو چکے ہیں ــــــ وقت پرستی نے ہماری ساری صلاحیتیں ختم کر دی ہیں ــــــ

ہمیں چاہیئے کہ ہم نہ وقت کا انتظار کریں اور نہ وقت کا استقبال کریں کیونکہ ترقی وہی کرتے ہیں جو وقت کو اپنا غلام بنا لیتے ہیں، جو وقت کو اپنا تابعدار بنا لیتے ہیں، جو وقت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور جو گزرے ہوئے وقت کا کوئی ماتم نہیں کرتے ــــــ

ــــــ مدیران

www.taemeernews.com

انٹرویو

اردون کے سفیر ہز ایکسی لینسی مسٹر کمال الحمود

شبستاں سیاسی جریدہ نہیں ہے لیکن ہم اس میں سیاسی شخصیتوں کے انٹرویو اس لئے شائع کرتے ہیں کہ ہمارے ملک کے عوام نہ صرف یہ کہ ان کی بھی زندگی سے واقف ہوسکیں بلکہ ان کے افکار و نظریات بھی انہی کی زبان میں جان جائیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہمارا ان سے اتفاق بھی ہو

میں دنیا کے سب سے قدیم ملک کے سفیر سے ملاقات کرنے جارہا تھا۔ مجھے اس ملک کے سفارتی نمائندہ سے انٹرویو لینا تھا جو ابھی بائیس سال قبل ۱۹۴۶ء میں آزاد ہوا تھا جس کا رقبہ صرف ۳۷ ہزار مربع میل ہے جس کی آبادی صرف بیس لاکھ ہے لیکن پچھلے سال کی عرب اسرائیل جنگ میں جس کی چھوٹی سی فوج نے جو بہادری دکھائی تھی اور جس شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا اس نے ساری دنیا کے فوجی ماہرین کو انگشت بدندان کر دیا تھا۔

اس جنگ کے خاتمہ پر جب اردنی سپاہیوں کی بہادری کی کہانیاں ستاروں کی طرح چمکی تھیں تو ساری دنیا کے ساتھ میں نے بھی اردون کو سلام کیا تھا۔

میں نے سلام کیا تھا اردون کی اس زمین کو جو شہیدوں کے خون سے سُرخ ہو چکی تھی۔ میں نے سلام کیا تھا ان لاشوں کو جو ہفتوں میلوں لمبے علاقے میں بے گور و کفن پڑی رہی تھیں۔ میں نے سلام کیا تھا جوانوں کے اس لہو کو جس نے حق و صداقت کے چراغ روشن رکھے جس نے عربوں کا سر اونچا رکھا اور جس نے ساری دنیا کے حق پرستوں کے حوصلے بلند کر دئے۔

اردون نے واقعی عربوں کی لاج رکھ لی تھی اور اب عرب اسرائیل جنگ کے اٹھارہ ماہ بعد میں اردون

www.taemeernews.com

بیت المقدس کی اس مسجد کے محراب و منبر ساری دنیا سے ایک سوال کر رہے ہیں

کی آپ بیتی سننے کے لئے اردون کے سفیر ہز ایکسی لینسی مسٹر کمال الحمود سے ملنے جا رہا تھا — دل میں ایک درد لئے ہوئے ایک تڑپ کے ساتھ ایک سوز کے ساتھ ایک تپش کے ساتھ۔

میں جب اردون کی ہاشمی سلطنت کے سفارت خانے کی عمارت میں داخل ہوا تو ایک لمحہ کے لئے جیسے میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ پوری عمارت پر ایک اداسی سی چھائی ہوئی تھی اور پھر جب میں مسٹر کمال الحمود کے کمرے میں داخل ہوا تو ایک ہی نظر میں میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ صرف عمارت ہی اداس نہیں ہے، صرف ماحول ہی سوگ میں ڈوبا ہوا نہیں ہے مسٹر کمال الحمود بھی اداس ہیں۔

یہ اداسی اردون کے بیس لاکھ انسانوں کی اداسی کی ترجمانی کر رہی تھی۔ مسٹر کمال الحمود نے عربوں کے روایاتی اخلاق کے ساتھ میرا استقبال کیا اور پھر کچھ اس انداز سے میرے سوالوں کے جواب دئے کہ میں ان کی عظمت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا۔

ان کا کمرہ بالکل سادہ تھا، نہ قیمتی فرنیچر نہ دیواروں پر آرٹ کے مرقعے، نہ دروازوں پر ریشمی پردے — بس

www.taemeernews.com

ایک دیوار پر شاہ حسین کی تصویر مسکرا رہی تھی۔ میں نے صوفے پر بیٹھنے سے قبل ایک مرتبہ پھر شاہ حسین کی تصویر کو دیکھا اور جیسے میرے کانوں میں ان کی وہ آواز گونجنے لگی جو پچھلے سال اقوام متحدہ میں گونجی تھی ——— انہوں نے اقوام متحدہ میں کہا تھا " اردن کا بچہ بچہ اپنی جان دے سکتا ہے لیکن اسرائیل کے آگے سر نہیں جھکا سکتا، یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم جنگ ہار گئے ہیں کیونکہ حق و باطل کی جنگ میں حق کی شکست کبھی بھی نہیں ہوتی ہے اردن کے عوام فیصلہ کر چکے ہیں کہ یا وہ فنا ہو جائیں گے اور یا اسرائیل سے اپنا کھویا ہوا علاقہ واپس لے لیں گے"۔

میری نظریں شاہ حسین کی اس تصویر پر جیسے جم کر رہ گئی تھیں ـــ میں سوچ رہا تھا آج سے تیرہ سو سال قبل بھی ایک حسین نے حق و باطل کی جنگ لڑی تھی۔ حق و باطل کی یہ جنگ کوئی نئی جنگ بھی نہیں ہے۔ دنیا میں ظالم و مظلوم، جابر و مجبور اور سعادت و خباثت کی یہ جنگ ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ جنگ کبھی خلیل و نمرود کی جدجہد کی صورت میں سامنے آئی کبھی موسیٰ اور فرعون کا مقابلہ بن گئی اور کبھی حسین اور یزید کے معرکہ میں تبدیل ہو گئی۔

اور پھر جیسے خود بخود میری آنکھیں نم ہو گئیں میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں شاہ حسین کی تصویر سے ہٹا لیں۔

میں نے مسٹر کمال المحمود سے سب سے پہلے اردن کے بارے میں سوالات کئے۔ انہوں نے میرے ان سوالوں کے جواب میں کہا کہ اردن شاید دنیا کا سب سے قدیم ملک ہے یہاں ایک ایسا قصبہ بھی ہے جہاں بارہ ہزار سال قبل بھی انسان رہتے تھے، سرزمین اردن نے بے شمار تہذیبیں دیکھی ہیں اور لاتعداد طاقتوں کا عروج و زوال دیکھا ہے۔ اردن کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ یہاں جناب ابراہیم علیہ السلام، جناب اسحٰق علیہ السلام جناب یعقوب علیہ السلام اور جناب موسیٰ علیہ السلام ایسے انبیاء کی آخری آرام گاہیں بھی ہیں۔

انہوں نے میرے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ پہلے اردن کو شرق اردن کہا جاتا تھا لیکن اب اس کا نام صرف اردن ہے۔

ہز ایکسی لینسی نے اردن کے بارے میں میرے سوالوں کے جواب میں کہا: "شرق اردن میں دستوری بادشاہت قائم ہے، وہاں برطانیہ کی طرح بادشاہت بھی ہے اور پارلیمنٹ بھی، پارلیمنٹ کے ایوان بالا میں تیس ممبر ہیں اور ایوان زیریں میں ساٹھ، ملک میں کوئی سیاسی جماعت نہیں ہے اور نہ سیاسی گروہ بندی ہے البتہ پارلیمنٹ میں حزب مخالف ضرور موجود ہے لیکن اسرائیل کے مسئلہ پر پارلیمنٹ کے ممبروں میں کوئی اختلاف نہیں ہے"۔ انہوں نے مزید کہا: اسرائیلی حملے کے بعد بہت سے ممبران پارلیمنٹ مغربی کنارے پر رہ گئے اور بہت سے گرفتار ہو گئے چنانچہ حملہ کے بعد پارلیمنٹ کا جو پہلا اجلاس ہوا اس کا کورم پورا نہ ہو سکا۔ لیکن دوسرے اجلاس میں کورم پورا ہو گیا"۔

میں نے پوچھا: "العاصفہ اور الفتح میں کیا فرق ہے"

انہوں نے جواب میں کہا: "یہ دونوں تنظیمیں فلسطین کو یہودیوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لئے قائم ہوئی تھیں۔ دونوں کا مقصد ایک ہے۔ العاصفہ کو الفتح کا حصہ ہی سمجھنا چاہئے ان تنظیموں کا کوئی لیڈر نہیں ہے ان کا کوئی کمانڈر نہیں ہے اور یہ مجاہدین آزادی الجیریا کی تحریک آزادی کو مشعل بنا کر اسرائیل کے خلاف جنگ لڑ رہے ہیں"۔

www.taemeernews.com

اب میں نے پوچھا: "پچھلے سال کی جنگ میں شرق اردن کا کتنا جانی نقصان ہوا" جواب دینے سے قبل وہ کچھ دیر سوچتے رہے میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے پر حزن و ملال کی گھٹائیں سی چھا رہی ہیں اور ایک نہ نظر آنے والا کرب ان کے چہرے پر ابھر رہا ہے انہوں نے بڑی مدھم آواز میں کہا: "ایک عام اندازے کے مطابق اردن کے چھ یا سات ہزار فوجی اور شہری اس جنگ میں شہید ہوئے اور دس ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ اس جنگ میں اردن کے آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے لیکن یہ غلط ہے" انہوں نے میرے اس سوال کے جواب میں مزید کہا" اس وقت اسرائیل کی جیلوں میں تقریباً پندرہ سو اردنی فوجی اور شہری قید ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ تعداد اس سے بھی زیادہ ہو"

اردن کے نقصانات کے بارے میں انہوں نے مزید کہا" اس جنگ میں اردن کا پانچ ہزار کلو اسکوائر میٹر علاقہ اسرائیل کے قبضہ میں چلا گیا بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ آدھے اردن پر اس وقت اسرائیل کا قبضہ ہے اور یہ وہ علاقہ ہے جو اردن کا سب سے زیادہ زرخیز اور شاداب علاقہ تھا اسرائیل کی زبردست بمباری کی وجہ سے بھی بے اندازہ نقصان ہوا ہے۔ ہزاروں مکانات گر گئے اور سیکڑوں گاؤں ویران ہو گئے"

وہ میرے سوال کا جواب دیتے رہے اور میں ان کی طرف دیکھتا رہا۔ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ انسان فطرتاً کتنا ظالم ہوتا ہے یقیناً انسان اس دنیا کا سب سے خوفناک درندہ ہے۔ ہز ایکسی لینسی اردن کے جانی اور مالی نقصان کی تفصیل بتاتے رہے اور میری نظروں کے سامنے ان بستیوں کے مناظر گھومتے رہے جہاں آج اسرائیلی عربوں پر نازیوں سے بھی بدتر مظالم ڈھا رہے ہیں جہاں زندگی موت کے لئے ترستی رہتی ہے اور جہاں کے رہنے والے عرب اپنی تاریخ کے انتہائی المناک دور سے گزر رہے ہیں اور جیسے میرے دل سے یہ آواز نکلی" اے میرے رب —— اردن کے اس نقصان کی تلافی کیسے ہو گی"

عرب اسرائیل جنگ کے نتیجہ میں مقبوضہ علاقہ کی حالت تو خراب ہے ہی لیکن سب سے زیادہ خراب حالت ان مہاجرین کی ہے جن کو اسرائیلیوں نے گھر سے بے گھر کر کے دریائے اردن کے اس پار دھکیل دیا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب کہ ان تباہ حال خانماں برباد عربوں کی پریشانیوں کی خبریں دنیا کے اخباروں میں نہ چھپتی ہوں۔ مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر میں نے بھی ان عرب مہاجرین کے بارے میں ہز ایکسی لینسی سے ایک سوال کیا۔ میں نے پوچھا" اردن میں آج کل کتنے مہاجرین ہیں اور ان کی زندگی کیسے بسر ہو رہی ہے"

میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا" آپ کا سوال مختصر ہے لیکن اس کا جواب آپ کو مختصر نہیں ملے گا۔ اس لئے کہ مجھے اس مسئلہ کی داستان بالکل ابتداء سے سنانی ہو گی" اس تمہید کے بعد انہوں نے کہا" قیام اسرائیل کے فوراً بعد یہودیوں نے فلسطین سے عربوں کو نکالنا شروع کر دیا تھا، چنانچہ صرف اردن میں تقریباً پانچ لاکھ عرب مہاجرین پناہ لینے کے لئے آ گئے۔ ہم نے ان کو عارضی طور سے کیمپوں میں ٹھہرایا اور اقوام متحدہ سے اپیل کی کہ وہ ان مہاجرین کو ان کے گھروں میں دوبارہ بسانے کا انتظام کرے لیکن اقوام متحدہ کی تمام کوششیں ناکام ہوئیں اور اسرائیل نے ان میں سے ایک مہاجر کو بھی واپس نہیں لیا۔ رفتہ رفتہ یہ مہاجر اردن کے دیہاتوں میں پھیلنے لگے اور انہوں نے اپنی آبادکاری خود ہی کر لی لیکن

www.taemeernews.com

اردن کے تباہ حال مہاجروں کے کیمپ جہاں زندگی موت کو ترستی رہتی ہے

پچھلے سال کی جنگ میں موشے دایان کی بمباری نے ایک مرتبہ پھر ان کو بے گھر کر دیا اور یہی نہیں بلکہ مزید ساڑھے تین لاکھ عربوں کو ہمارے علاقہ میں ڈھکیل دیا۔"

ہز ایکسی لینسی نے بڑی غم زدہ آواز میں کہا: "آج کل یہ مہاجر پہاڑوں پر سردی میں پڑے ہیں کیوں کہ میدانی علاقوں میں ہر وقت اسرائیلی بمباری کا خطرہ رہتا ہے۔ ان مہاجروں کی مصیبت کا اندازہ صرف اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ خشک پہاڑوں میں رہ رہے ہیں جہاں پانی تک کا کوئی انتظام نہیں۔ اسرائیل ان کو واپس لینے سے مسلسل انکار کر رہا ہے اور ان کے ان مکانوں میں جنہیں چھوڑ کر وہ ہمارے یہاں چلے آئے تھے۔ یہودیوں کو آباد کر رہا ہے۔"

انہوں نے عرب مہاجروں کے بارے میں میرے سوال کے جواب میں مزید کہا: "گذشتہ ماہ سے مہاجروں کی آمد رک گئی ہے کیوں کہ اردن نے مزید مہاجروں کو لینے سے انکار کر دیا ہے اور اپنی سرحدیں بند کر دی ہیں۔ یہ اقدام ہم نے اس لئے کیا ہے کہ اسرائیل جن عربوں کو بے گھر کر رہا ہے وہ اپنے قیام کی جنگ لڑیں اور یہ مسئلہ حل ہو جائے۔"

انہوں نے کہا: "گذشتہ بیس سال سے اردن عرب مہاجرین کے لئے آواز بلند کر رہا ہے اور اس کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہو رہی ہے۔ میں پوچھتا ہوں آخر کب تک یہ عرب مہاجر خیرات پر زندہ رہیں گے۔"

انہوں نے مزید کہا: "آپ کے لئے یقیناً یہ ایک بالکل نئی خبر ہوگی کہ اسرائیلی گولہ باری اور بمباری کی وجہ سے اب تک سینکڑوں مہاجر ہلاک ہو چکے ہیں دریائے اردن کے کنارے کنارے جن کیمپوں میں فلسطینی مہاجر رہتے تھے وہ ان کیمپوں کو چھوڑ چکے ہیں کیوں کہ اسرائیلی ان کیمپوں پر دن رات گولہ باری کرتا رہتا ہے۔" انہوں نے کہا: "اردن کا سارا زرخیز علاقہ اسرائیل کے قبضے میں ہے انتہائی بنجر علاقے میں یہ مہاجر پڑے

www.taemeernews.com

بیت المقدس کی اس مسجد میں تالا ڈال دیا گیا ہے

ہوئے ہیں اور دایان کا چیلنج ہے کہ وہ ان کو بالکل تباہ کر دے گا لیکن . . ."

ہز ایکسی لینسی نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا. شائد شدتِ جذبات کی وجہ سے ان کی آواز بھرا گئی اور رک گئی یا سفارتی آداب نے ان کو دل کی بات کہنے سے روک دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اس مسئلہ پر کوئی اور بات نہیں کی. وہ خاموش ہو گئے اور میرے اگلے سوال کے انتظار میں میری طرف دیکھنے لگے ــــــ لیکن میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہے ہیں وہ ان لاکھوں مہاجروں کی طرف دیکھ رہے ہیں جو سرزمین اردن پر موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہیں.

چند لمحات کی خاموشی کے بعد میرے ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا: "اسرائیل نے ہم کو بھوکا مارنے کے لئے، ہمارے کھیتوں کو خشک کرنے کے لئے اور ہمارے کسانوں کو برباد کرنے کے لئے دریائے اردن کا رُخ موڑنے کے منصوبہ پر عمل شروع کر دیا ہے"

ان کا یہ جواب سننے کے بعد مجھ سے برداشت نہ ہو سکا. میں نے پوچھا: "عرب ممالک اسرائیل پر حملہ کیوں نہیں کرتے" انہوں نے جواب میں بڑی سنجیدگی سے کہا: "تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ باہر سے آئی ہوئی کسی قوم کو کسی ملک کی قدیم آبادی پر لاد دیا جائے۔ اسرائیل کا بحیثیت قوم کبھی بھی کوئی وجود نہیں تھا لیکن سامراجی طاقتوں نے سازش کر کے اس کو ایک قوم بنا دیا اور اب اس قوم کے نام پر عربوں پر جو ظلم ہوا ہے اس کی مثال بھی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی"

مجھے چونکہ میرے سوال کا جواب نہیں ملا تھا اس لئے میں ان کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھتا رہا.

ایک لمحہ کے توقف کے بعد انہوں نے کہا: "اسرائیل کے معاملہ میں ساری دنیا ہمارے خلاف تھی صرف ہندوستان اور چند مسلم ممالک ہمارے ہم نوا تھے ہم نے اقوام متحدہ کے سامنے اپنا معاملہ پیش کیا ہے ہم انصاف چاہتے ہیں اور ہمارا چیلنج ہے کہ جب تک ہمارے ساتھ انصاف نہیں ہوگا مشرق وسطیٰ میں امن قائم نہیں ہو سکتا"

ان کا یہ جواب سننے کے بعد میں سمجھ گیا کہ قومی مصلحت کے پیش نظر شاید وہ کھل کر میرے سوال کا جواب دینا نہیں چاہتے.

یہ ٹھیک ہے کہ نئی جنگ کے بارے میں انہوں

www.taemeernews.com

نے اپنی زبان سے میرے سوال کا کوئی واضح جواب نہیں دیا تھا لیکن ان کی غیض و غضب میں ڈوبی ہوئی آنکھوں نے، ان کے اچانک سرخ ہو جانے والے چہرے نے، ان کے بھینچے ہوئے ہونٹوں نے اور ان کے ہاتھ کی بند ہوتی ہوئی مٹھی نے میرے سوال کا جواب دے دیا تھا ـــ چنانچہ میں نے اپنے سوال کے جواب کے لئے اصرار نہیں کیا ـــ کیونکہ بعض باتیں زبان سے نہیں کہی جاتی ہیں آنکھوں ہی آنکھوں میں بیان کر دی جاتی ہیں۔

اب میں نے ان سے پوچھا "اس جنگ میں اردن کو سامان جنگ کا جو نقصان ہوا ہے وہ کیسے پورا کیا جا رہا ہے؟ کیا اردن نے بھی روس سے ہتھیار لئے ہیں۔" انہوں نے جواب میں کہا "نہیں ہم نے روس سے ہتھیار نہیں لئے ہیں حالاں کہ روس ہمیں ہتھیار دینا چاہتا تھا۔ ہم نے روس کی پیش کش اس لئے قبول نہیں کی کہ پھر عرب اور اسرائیل کی جنگ کو مشرق اور مغرب کی لڑائی کا نام دے کر اسرائیل مغربی طاقتوں سے اور زیادہ ہتھیار حاصل کر لیتا۔ اس جنگ میں ہمیں ستا کروڑ پونڈ کی مالیت کے ہتھیاروں اور دوسرے سامان جنگ کا نقصان ہوا ہے۔ عرب ممالک نے ہمیں ساڑھے پانچ کروڑ پونڈ کی مالی امداد دی تھی جس میں سے تین کروڑ پونڈ ہم نے عرب مہاجروں پر صرف کئے اور ڈھائی کروڑ پونڈ کے ہتھیار خریدے۔ یہ اسلحہ ہمیں مل گئے ہیں اور یا ملنے والے ہیں۔" انہوں نے مزید کہا "ہمارے پاس صرف برطانوی اور امریکی اسلحہ ہیں۔ ابھی حال میں ہمیں امریکہ سے بھی بیس ہیلی کاپٹر ملے ہیں جو ہتھیار لئے لیس ہیں اور وہ دن بہر حال زیادہ دور نہیں ہے جب اردن میں سامان جنگ کی کمی پوری ہو جائے گی۔"

میرے ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حالیہ جنگ میں اسرائیل کا جانی اور مالی نقصان بہت کم ہوا۔ اسرائیلی بھی بہت بڑی تعداد میں مارے گئے ہیں۔"

میں نے پوچھا "ماضی میں اُردن اور برطانیہ کے درمیان بڑے اچھے تعلقات تھے کیا اس جنگ کے بعد بھی ان تعلقات کی خوشگواری باقی ہے؟" انہوں نے کچھ سوچنے کے بعد جواب میں کہا "برطانیہ ہی اسرائیل کے قیام کا ذمہ دار ہے اور برطانیہ کی کوششوں سے ہی اسرائیل عالم وجود میں آیا۔" انہوں نے کہا "لیکن ہمارے اور برطانیہ کے تعلقات باقی ہیں کیوں کہ برطانیہ کی اسرائیل دوست پالیسی میں تبدیلی آگئی ہے۔"

اب میں نے پوچھا "آخر اس کا کیا سبب ہے کہ اُردنی سپاہیوں کے بہادرانہ کارناموں کی تفصیل اخبارات میں نہیں آئی ہے۔" انہوں نے کہا "ہم ایک شدید بحران سے دوچار ہیں اور اسی لئے ہم نے اب تک یہ کام نہیں کیا ہے لیکن اُردنی سپاہیوں کی بہادری کا اعتراف خود دشمن نے کیا ہے۔ اسرائیلی فضائی فوج کے کمانڈر کرنل ہڈ نے ابھی حال میں ایک تقریر کی تھی، اپنی اس تقریر میں اس نے کہا تھا کہ اگر مجھ سے یہ کہا جائے کہ میں بہادری کا مجسمہ بناؤں تو میں اُردنی سپاہی کا مجسمہ بنا دوں گا۔"

انہوں نے مزید کہا "اُردن کے عوام اب بھی شجاعت سے بھرے کارنامے انجام دے رہے ہیں۔ ابھی چند دنوں کا ذکر ہے کہ اُردن کا ایک بارہ سالہ لڑکا یروشلم کے فوجی ہیڈ کوارٹر کی عمارت میں بم رکھ آیا تھا۔

www.caemeernews.com

یروشلم کا عرب محلہ جو اب کھنڈر بن چکا ہے

اسرائیلی عوام کی دہشت کا یہ عالم ہے کہ وہ اُردنی نوجوان کے آمنے سامنے آنے سے گھبراتے ہیں اور انہیں ہر وقت ان کی طرف سے خطرہ لگا رہتا ہے۔"

مسجدِ اقصیٰ کی سلامتی کے بارے میں میرے ایک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا "اسرائیلی روز دُعا مانگتے ہیں کہ مسجدِ اقصیٰ کسی طرح مسمار ہو جائے، وہ یہ دُعا مانگتے ہیں کہ زلزلہ آجائے اور مسجد گر جائے۔ انہوں نے بیت المقدس کے مذہبی مقامات کی بے حرمتی کرنے میں بھی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔"

میں نے چاہا کہ ان سے الخلیل کی مسجد ابراہیم کے بارے میں سوال کروں جسے اسرائیلیوں نے گولہ باری کرکے زمین کی برابر کردیا ہے۔ میں نے سوچا اُن سے مسجد عمرؓ کی اس محراب کے بارے میں سوال کروں جسے اسرائیل مسمار کرچکا ہے، میں نے ارادہ کیا کہ میں ان سے رم اللہ کی اس مسجد کے بارے میں پوچھوں جس کا اب کوئی وجود باقی نہیں رہا ہے لیکن پھر میں نے سوچا کہ ان سب سوالوں کے جواب تو مجھے خود معلوم ہیں۔ میں یہ سوال کرکے ہز ایکسی لینسی کا دل کیوں دکھاؤں، یہ واقعات تو دل کا داغ بن چکے ہیں یہ حادثات تو سارے عالمِ اسلام کے لئے ایک چیلنج بن چکے ہیں۔ اسرائیل کی یہ کارروائیاں تو کلیجے کا ناسور بن چکی ہیں۔

میں نے اب تک مسٹر کمال الحمود سے صرف اُردون اور جنگ کے بارے میں سوالات کئے تھے۔ میں نے اُن سے خود اُن کے بارے میں اب تک کچھ دریافت نہیں کیا تھا۔ اس لئے اب میں نے ان سے اُن کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ سوال کئے۔ ان کے جواب میں انہوں نے کہا "میں چار سال قبل ہندوستان آیا تھا۔ میں ہندوستان کے علاوہ لنکا، تھائی لینڈ، نیپال اور ملیشیا میں بھی اپنے ملک کی سفارت کے فرائض انجام دے چکا ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔ میری بیوی عنایہ ۱۹۴۸ کی مہاجر ہے۔ وہ دس سال کی تھی جب اسرائیلیوں نے اس کے والدین کو گھر سے بے گھر کرکے فلسطین سے نکال دیا تھا پچھلے سال کی جنگ میں بھی اس کے خاندان کو نقصان پہنچا۔ اس کی بہن مغربی کنارے پر رہ گئی اور اس کے

www.taemeernews.com

دریائے اُردون جس کا رُخ اسرائیل موڑنا چاہتا ہے

عرب مہاجرین صحرا صحرا گھوم رہے ہیں

بچا کو اپنا گھر خالی کرنا پڑا۔" انہوں نے کہا "میری بیوی کو پختہ یقین ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنے وطن ضرور واپس جائے گی اور یہاں اپنے ہندوستانی دوستوں سے اکثر اس کا تذکرہ کرتی ہے۔"

انہوں نے میرے اس سوال کے جواب میں مزید کہا "عرب اسرائیل جنگ میں اب تک میرے بارہ رشتے دار شہید ہو چکے ہیں۔"

ان کا یہ جملہ ختم ہوتے ہی میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ غم و افسوس کی کوئی ہلکی سی پرچھائیں بھی اُن کے خدوخال پر نہیں تھی۔ وہ عزم و ہمت کی ایک چٹان کی طرح نظر آ رہے تھے۔

اب انٹرویو ختم ہو چکا تھا۔

لیکن ابھی انٹرویو ختم نہیں ہوا تھا اس لئے کہ اُردون کی جو آپ بیتی سننے کے لئے میں نے یہ انٹرویو لیا تھا وہ ابھی ادھورا تھا۔ یہ آپ بیتی اس وقت تک ادھوری رہے گی جب تک کہ اسرائیل کی جارحیت کا خاتمہ نہیں ہو جائے گا۔ جب تک ایک مرتبہ پھر مسجد اقصےٰ کا صحن نمازیوں سے بھرا ہوا نظر نہ آئے گا اور جب تک بیت المقدس کے کوچے کوچے میں عربوں کے پرچم لہراتے نظر نہ آئیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ میری ہی نہیں ہر حق پرست کی تمنا ہوگی کہ عربوں کو ان کے خون کا خراج وصول ہو اور اسرائیل سے اس کی درندگی کا بدلہ لیا جائے۔

مجھے یہ بھی یقین ہے کہ عربوں کی فتح کا دن ضرور آئے گا کیوں کہ جب تک یہ دن نہیں آئے گا صلاح الدّین کی رُوح کو چین نہیں آئے گا اور یہ ناممکن ہے کہ پاک روحیں بے چین رہیں۔

ایک عجیب عالمِ بے خودی میں میں جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شاہ حسین کی تصویر اب بھی مسکرا رہی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس تصویر کی مسکراہٹ کو سلام کیا۔ یہ مسکراہٹ یقیناً عظیم تھی۔ کیونکہ عظیم اور قیمتی مسکراہٹ وہی ہوتی ہے جو زخموں کو دبا کر چہرے پر بکھیری جائے۔

عراق کو ویت نام سے سبق لینا چاہیے

آخرکار امریکہ نے ویت نام کے سامنے سر جھکا دیا۔ طاقت اور دولت کے نشے میں چور امریکہ کے بیس کروڑ انسانوں نے ویت نام کے ڈیڑھ کروڑ ننگے اور بھوکے حریت پسندوں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔

ویت نام ۱۹۴۶ سے ۱۹۵۴ تک فرانس سے اپنی آزادی کی لڑائی لڑتا رہا اور اس کے بعد اس کی امریکہ سے جنگ شروع ہوگئی۔ امریکہ نے اس جنگ میں ویت نام پر اوسطاً ہر ماہ ۷۷ ہزار ٹن بم گرائے۔ اس کی چار لاکھ فوجیں مورچوں پر ڈٹی رہیں اور وہ اس جنگ پر ہر ماہ سات ارب ڈالر خرچ کرتا رہا۔

امریکہ نے اس جنگ میں اپنے مظالم سے چنگیز، ہلاکو اور ہٹلر کی روحوں کو شرمندہ کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود ویت نامیوں نے نہ ہمت ہاری تھی اور نہ ان کے حوصلے پست ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ جنگ جنگلوں، باغوں، اسکولوں، ہسپتالوں اور حد یہ کہ اپنے مکان کے برآمدوں تک میں لڑی اور اس طرح لڑی کہ آخرکار امریکہ تھک گیا۔ امریکہ نے غیر مشروط طور پر جنگ بند کر دی۔

اس طویل جنگ میں ویت نام کے عوام نے نہ زندگی کو اہمیت دی اور نہ موت کو ——— وہ نہ بموں کے دھماکوں سے

www.taemeernews.com

خوف زدہ ہوئے اور نہ توپوں کے گولوں سے۔ ویت نام نے اس جنگ میں اپنے لاکھوں بیٹے کٹوا دیئے لیکن آزادی کے اس مسلک سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا جس کو اس نے اپنی قومی زندگی کا لازمی جزو بنا لیا تھا۔

امریکہ کے آواز سے زیادہ تیز رفتار طیارے روزانہ ویت نام پر بمباری کرتے تھے اور ویت نام کے پاس ان موت بردار امریکی طیاروں کے مقابلہ کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ ان طیاروں نے امن انصاف اور آزادی کے نام پر پورے ویت نام کو قبرستان اور کھنڈر میں تبدیل کر دیا تھا۔ زندگی بالکل معطل ہو کر رہ گئی تھی۔ تمام پل ٹوٹ گئے تھے، ہر کارخانہ مسمار ہو گیا تھا، ہزاروں گاؤں ویران ہو گئے تھے لیکن ویت نام نے اپنے حوصلے باقی رکھے ــــ امریکی طیاروں کا مقابلہ بندوقوں سے کیا گیا ــــ جب فضا میں امریکی ہوائی جہاز نظر آتے ویت نام کی نازک عورتیں رائفل لے کر اپنے مکانوں کی چھتوں پر آ جاتیں۔ ان عورتوں کو نہ ان امریکی جہازوں سے ڈر لگتا تھا اور نہ موت سے ــــ!

ویت نام نے اس طویل جنگ کے دوران اپنے دوست ممالک سے فوجی رضا کار نہیں مانگے، وہاں کا ہر بالغ مرد اور ہر عورت سپاہی تھا، کھیتوں میں دھان بونے والا کسان پلک جھپکتے میں ہل چھوڑ کر رائفل اٹھا لیتا تھا، کارخانوں میں کام کرنے والا مزدور سائرن کی آواز سنتے ہی سپاہی بن جاتا تھا۔ ہر ویت نامی ہر وقت مرنے اور مارنے کے لئے تیار رہتا تھا آزادی کے لئے وہ ہر شے قربان کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

اس جنگ میں امریکہ نے ویت نام کو ایک دہکتی ہوئی بھٹی میں تبدیل کر دیا تھا۔

ویت نام کی یہ جنگ اس صدی کی سب سے طویل جنگ تھی ــــ پہلی جنگ عظیم چار سال میں، چین اور جاپان کی جنگ بارہ سال میں، دوسری جنگ عظیم چھ سال میں، کوریا کی جنگ تین سال میں اور الجیریا کی جنگ سات سال میں ختم ہو گئی تھی لیکن ویت نام نے یہ جنگ بائیس سال لڑی ویت نام کی ایک پوری نسل لڑ کر ختم ہو گئی تو دوسری نسل نے بھی یہ لڑائی جاری رکھی۔ اس جنگ میں لاکھوں انسان مر گئے، لاکھوں قیدی بنا لئے گئے، اور لاکھوں عورتیں بیوہ ہو گئیں۔

اس جنگ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ یہ جنگ ــــ امریکہ نے ایک بے جان قوم پر محض اپنی ساکھ اور اپنا وقار باقی رکھنے کے لئے لادی تھی۔ امریکہ یہ ہولناک جنگ اپنی سرزمین سے ہزاروں میل دور لڑ رہا تھا۔

یہ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ امریکہ کے صدر جانسن اپنی شکست تسلیم کر چکے ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اگر عزم جوان ہو، مقصد نیک ہو اور جذب اندرون بیدار ہو چکا ہو تو کمزور بھی طاقت ور پر غالب آ سکتا ہے۔

یہ جنگ عربوں کے لئے ایک سبق ہے۔ عربوں کی تعداد دس کروڑ ہے اور اسرائیل اور اس کے مددگاروں کی تعداد تقریباً چالیس کروڑ۔

لیکن تعداد اور وسائل کی کمی کے باوجود عرب اسرائیل اور اس کے سامراجی دوستوں کو شکست دے سکتے ہیں ضرورت صرف امنگ کی ہے، جوش کی ہے، ولولہ کی ہے اور آہنی ارادوں کی ہے۔

ویت نام نے عربوں کو ایک راہ دکھائی ہے اور یہ عربوں کی بدقسمتی ہوگی اگر وہ اس راہ پر گامزن نہ ہوئے۔

ویت نام میں امریکہ کی شکست عربوں کے لئے ایک پیغام ہے اور اگر عربوں نے یہ پیغام نہ سنا تو عرب کسی نئی تاریخ کی تخلیق نہ کر سکیں گے۔

www.taemeernews.com

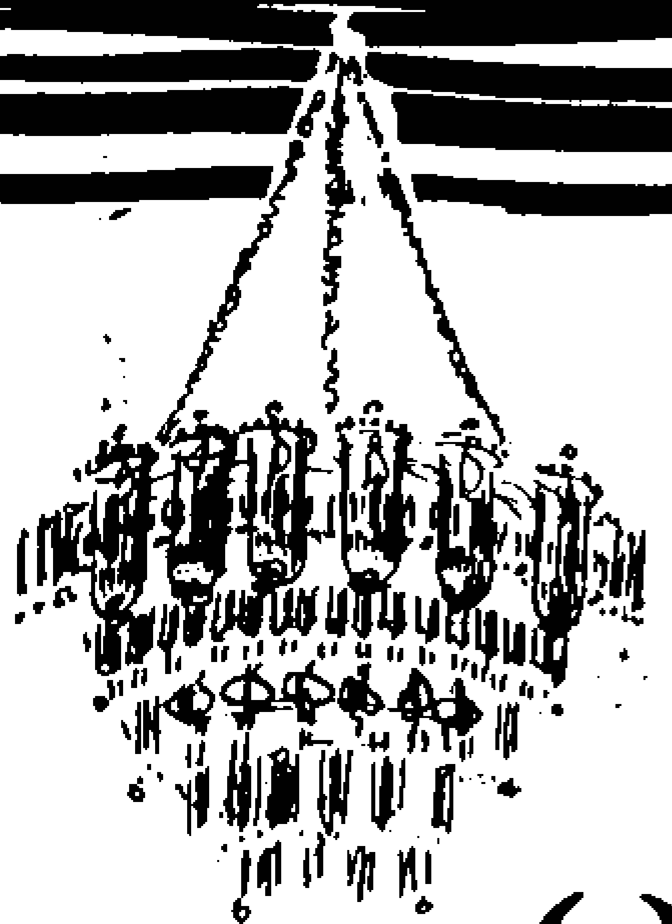

اردو ڈائجسٹ

شبستان

کا

سال نامہ ۱۹۶۹

دسمبر کے وسط تک
آپ کی خدمت میں پیش
کر دیا جائے گا
اس سال نامے میں وہ سب کچھ ہوگا
جو شبستان کو دوسرے
سب رسالوں سے ممتاز بنا چکا ہے۔
قیمت : تین روپے

یہ سال نامہ حاصل کرنے کے لئے آج ہی بیس روپے بھیج کر خریدار بن جائیے
یا اپنی کاپی کا آرڈر اپنے اخبار فروش کے پاس نوٹ کرا دیجئے۔

شبستان اردو ڈائجسٹ، آصف علی روڈ، نئی دہلی

www.taemeernews.com

ڈبلیو ای گیرٹ

میکسیکو

جس کی حیثیت —
ایک تاریخی عجائب گھر کی سی ہے!

میکسیکو میں عالمی اولمپک ہونے والے تھے مجھے وہاں جانا ضروری تھا اس لئے میں نے سوچا کہ جب وہاں جانا ہی ہے تو کیوں نہ دو ماہ پہلے وہاں پہنچ جایا جائے تاکہ میں میکسیکو کی سیاحت بھی کرلوں۔ میکسیکو کے بارے میں میں اب تک بے شمار زندہ اور مردہ کہانیاں سُن چکا تھا اور یہ ملک دیکھنے کی تمنا ایک عرصے سے میرے دل میں انگڑائیاں لے رہی تھی۔

میکسیکو کا قلب اس کا دارالسلطنت میکسیکو ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر میکسیکو کو میکسیکو ملک سے نکال دیا جائے تو وہاں کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ نیویارک اور شکاگو کے بعد میکسیکو امریکہ کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس کی عظمت، اس کی خوب صورتی اور اس کے حُسن کی کوئی حد و انتہا نہیں ہے۔ جب میں میکسیکو پہنچا تو شام ہو چکی تھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی اور پورا شہر چھلتی اور مچلتی رنگ برنگی روشنیوں کا ایک سمندر کی طرح نظر آرہا تھا۔

میں میکسیکو کی سڑکوں پر آیا تو یہاں مجھے پیرس سے زیادہ فیشن، اسپین سے بھی زیادہ حُسن، نیویارک سے بھی زیادہ دولت اور قاہرہ سے بھی زیادہ پُرانے لباس میں ملبوس عورتیں اور مرد نظر آئے، یہاں مجھے اتنے عظیم الشان ہوٹل دکھائی دیئے کہ میں ان کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور جوتوں پر پالش کرنے والے اتنے لڑکے نظر آئے کہ

www.taemeernews.com

میں ان کو جواب دیتے دیتے تھک گیا۔

میکسیکو میں مجھے رنگ برنگے لباس میں اتنی حسین عورتیں نظر آئیں کہ میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو گیا کہ شائد دنیا کی سب سے خوب صورت عورتیں میکسیکو میں ہی رہتی ہیں۔ اس شہر میں مجھے ۴۵ منزلہ عمارت کے نیچے دیہات سے آئے ہوئے کسان بھی ملے اور لندن سے آئے ہوئے ارب پتی تاجر بھی۔ پورا شہر اس طرح سجا ہوا تھا جیسے وہاں کوئی جشن منایا جانے والا ہے۔

مجھے اپنے میزبان کے یہاں پہنچنے کی جلدی تھی، میں ڈرائیور سے بار بار تیز چلنے کی تاکید کر رہا تھا تنگ آکر ڈرائیور نے کہا "مسٹر ـــــ یہ میکسیکو ہے۔ یہاں دیر سے آنے کو برا نہیں سمجھا جاتا ہے بلکہ آپ اگر کسی دعوت میں دیر سے پہنچیں گے تو آپ کی عزت بڑھ جائے گی کیونکہ اس طرح آپ کو مصروف ترین کاروباری آدمی سمجھا جائے گا۔"

میکسیکو کے بارے میں مجھے یہ پہلی نئی بات معلوم ہوئی اور اس کے بعد تو جیسے طلسم ہوش ربا کا دروازہ کھل گیا۔

پہلے ہی دن مجھے یہ بتایا گیا کہ اس ملک میں کسی قسم کے اعداد و شمار جمع نہیں کئے جاتے مثلاً حکومت کو یہ نہیں معلوم کہ ملک کی آبادی کیا ہے؟ یہاں سالانہ کتنا غلہ پیدا ہوتا ہے؟ یہاں سالانہ کتنے جرائم ہوتے ہیں؟ مجھے ایک اور نئی بات یہ بھی بتائی گئی کہ میکسیکو میں عوام ایک دوسرے سے ذاتی گفتگو کرنا پسند نہیں کرتے اور یہاں عام طور سے نو بجے رات کے بعد کوئی کام نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پروگرام نو بجے رات کے بعد بند کر دیئے جاتے ہیں۔

ایک پرانا گرجا جو اسپینیوں نے بنایا تھا

www.taemeernews.com

ہنستے مسکراتے چہرے میکسیکو میں ہر جگہ نظر آتے ہیں

پرانا لباس، پرانا شوق، گھوڑے سواری کا مظاہرہ

میکسیکو کی آبادی اندازاً ساڑھے تین کروڑ ہے۔
۱۹۴۰ء سے آبادی میں دگنا اضافہ ہوا ہے اور چونکہ یہاں نس بندی کے پروگرام پر عمل نہیں ہو رہا ہے اس لئے آبادی دن بدن بڑھتی جاری ہے آبادی ہی نہیں پیداوار بھی بڑھ رہی ہے اور زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی کافی ترقی ہو چکی ہے۔

میکسیکو کی طرح اس ملک کی تاریخ بھی بڑی زبردست ہے۔ یہاں ابتداء میں تانبے کی رنگت کے لوگ رہتے تھے، کبھی اُن کی بڑی زبردست حکومت تھی جو پورے جنوبی امریکہ میں پھیلی ہوئی تھی، تاریخ میں اس سلطنت کو مایا سلطنت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مایا نسل کے لوگ بڑے مہذب تھے اور اپنے مندر اور مقبرے مصری اہرام کی طرز کے بنایا کرتے تھے، آج بھی میکسیکو کے طول و عرض میں ایسے سینکڑوں اہرام موجود ہیں۔

قدیم باشندوں کی سلطنت کا خاتمہ ۱۵۱۹ء میں ہو گیا جب موجودہ 'ویرا کروز' کی بندرگاہ پر اسپین کے جنگی جہازوں نے لنگر ڈالا، اس بحری بیڑہ کا کمانڈر ہرنان کورٹس تھا اس کے ساتھ بے شمار فوج تھی اور ایک بڑا توپ خانہ بھی تھا، ہرنان نے ویرا کروز پر قبضہ کیا اور یہاں اپنی حکومت قائم کر لی اس کے بعد وہ اندرونِ ملک داخل ہوا اور پھر گھستا ہی چلا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ایک نئی تاریخ کی بنیاد

www.taemeernews.com

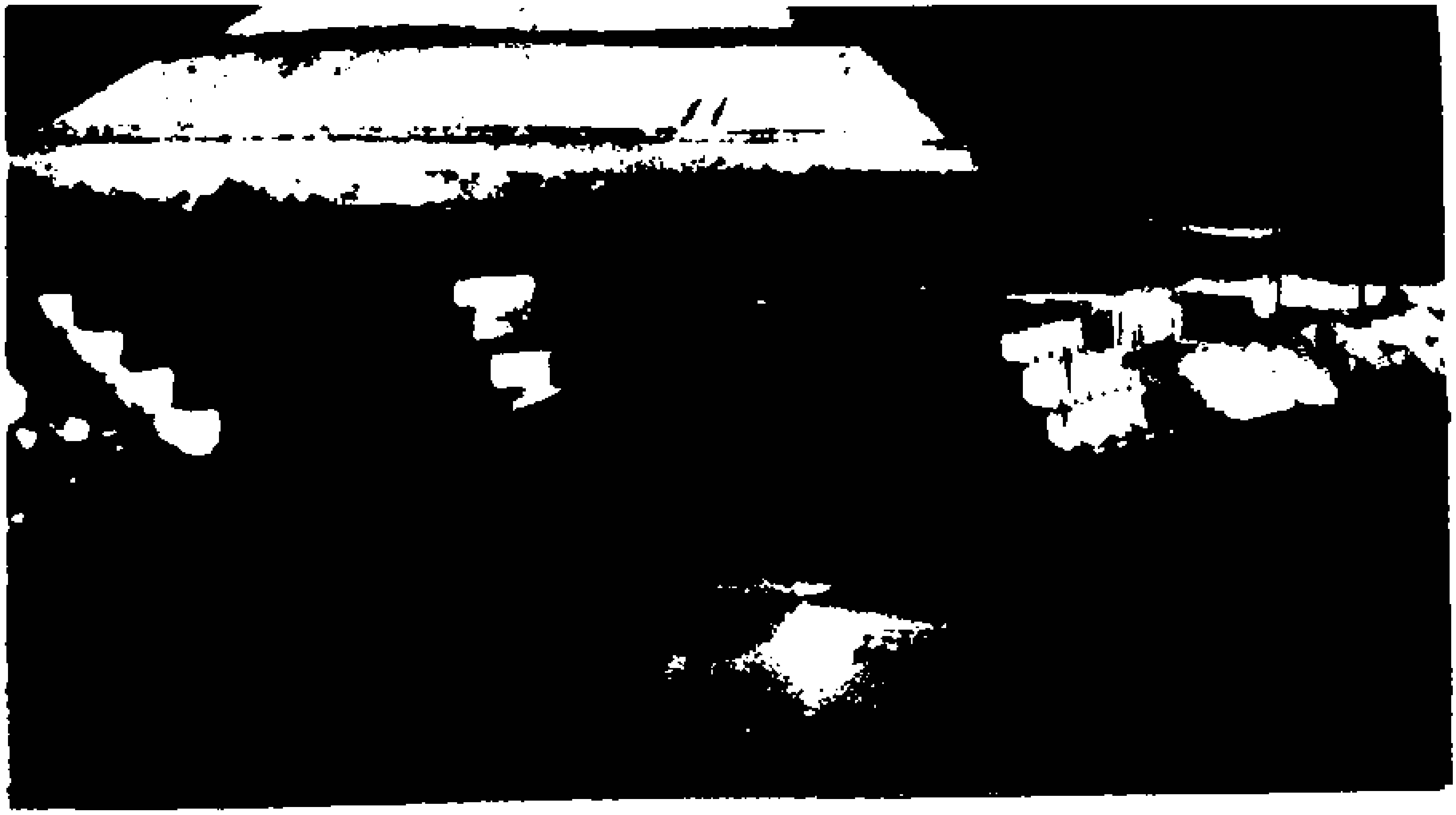

یہ قدیم اہرام میکسیکو سے چند میل کے فاصلہ پر بنا ہوا ہے

ڈال دی۔

تین سو برس تک اسپینی یہاں حکومت کرتے رہے اور میکسیکو کو لوٹتے رہے۔ ۱۸۴۷ میں ریاستہائے متحدہ امریکی فوجوں نے قبضہ کر لیا۔ ۱۸۶۲ میں یہاں فرانسیسی فوجیں داخل ہوئیں اور فرانسیسیوں نے میکسمان کو یہاں کا نمائشی شہنشاہ تسلیم کر لیا، اب بہرحال یہاں جمہوریت قائم ہے۔

میکسیکو کے عوام نے اپنے حکمرانوں سے بھی اور پھر یہاں کے ڈکٹیٹروں سے بھی ایک زبردست جنگ لڑی ہے۔ آج میکسیکو کے مشہور حریت پسند لیڈر ریواز پاٹا کا نام دنیا کے گوشے گوشے میں مشہور ہے۔ ریواز پاٹا کو میکسیکو کے ایک ڈکٹیٹر نے دھوکے سے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔

میکسیکو کی ساری تاریخ ظالموں اور مظلوموں کی کہانیوں سے بھری پڑی ہے۔ یہ خونی تاریخ پورے میکسیکو میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہے۔ میں جہاں گیا مجھے یہ تاریخ نظر آئی اور کبھی

اہرام کے باہر میدان میں دیوتاؤں کے بت

www.taemeernews.com

کبھی میری آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

میں نے اپنی سیاحت کی ابتداء ویراکروزسے ہی کی تھی اور میں بیان کر چکا ہوں کہ میکسیکو کی غلامی کی ابتداء بھی اسی بندرگاہ سے ہوئی تھی۔ آج اس بندرگاہ کی آبادی ایک لاکھ ۲۸ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ شہر کی تعمیر کچھ اس انداز کی ہے کہ ایک ایک گلی اور ایک ایک سڑک پر کسی اسپینی شہر کا گمان ہوتا ہے۔

ویراکروزسے میں شہر میکسیکو کے لئے بذریعہ بس روانہ ہوا۔ بس ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے قبل اپنے سینے پر کراس بنایا، دوسرے مسافروں نے بھی کراس بنایا اور اس کے بعد بس انتہائی تیز رفتاری سے میکسیکو کی جانب روانہ ہوگئی۔ میں نے بس کا سفر جان بوجھ کر کیا تھا، دراصل میں راستہ کا میکسیکو دیکھنا چاہتا تھا۔ اور وہ پہاڑ بھی جس کو میکسیکو کا سب سے بلند پہاڑ کہا جاتا ہے۔

راستہ اتنا خوب صورت اور اتنا حسین تھا کہ بعض مناظر دیکھ کر میں مبہوت رہ گیا ' اوری زابا' کی برفانی چوٹی کے علاوہ راستہ میں ہمان ایک پُرانا قلعہ بھی ملا جس کو مقامی زبان میں پھولوں کا قلعہ کہا جاتا ہے۔ قلعہ اسم بامسمیٰ ہے کیونکہ واقعی پورا قلعہ پھولوں سے اس طرح ڈھکا ہوا تھا کہ پھولوں کا ہی قلعہ معلوم ہوتا تھا۔

راہ میں ہمیں ایک جگہ گرم پانی کا ایک چشمہ ملا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ پانی پیٹ کے امراض کے لئے بہت مفید ہے۔ اس چشمے کا پانی بوتلوں میں بھر کر سارے میکسیکو میں فروخت کیا جاتا ہے۔ اس چشمے کے آگے اوری زابا کا قصبہ تھا جہاں بیئر بہت عمدہ بنتی ہے۔ اوری زابا کے آگے ایک قدیم اہرام ہے۔ اس اہرام کو اسپینیوں نے چرچ میں تبدیل

میکسیکو کے پُرانے حصّہ کا ایک معروف بازار

www.taemeernews.com

میکسیکو کی رات کا ایک منظر

کر دیا تھا اور یہاں رہنے والے تمام قدیم باشندوں کو عیسائی بنا لیا تھا۔ یہاں سے میں 'پوبلا' پہنچا جو میکسیکو کا چوتھا سب سے بڑا شہر ہے۔ اس کے تین جانب برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں اور چوتھی جانب سرسبز وادی۔ اس شہر کے کھانے بہت مشہور ہیں اور یہاں زمانۂ قدیم کی بہت سی عمارتیں اپنے شاندار ماضی کی کہانیاں سناتی رہتی ہیں۔ اس شہر میں کپڑا بنانے کے ۸۰ مل ہیں۔ اس شہر کی تاریخی اہمیت اس لئے اور بھی زیادہ ہے کہ ۵ مئی ۱۸۶۲ء کو یہاں چار ہزار مقامی باشندوں نے نپولین سوئم کے چھ ہزار فرانسیسی سپاہیوں کا جو میکسیکو پر قبضہ کرنے کے لئے فرانس سے آئے تھے مقابلہ کیا تھا۔ اب ہر سال میکسیکو کے عوام ۵ مئی کو اپنا جشنِ فتح مناتے ہیں کیونکہ انہوں نے اس جنگ میں فرانس کو شکست دے دی تھی۔

'پوبلا' کو شہر میکسیکو کا پہلا دروازہ بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ یہاں سے یہ عظیم اور مرغوب صورت شہر زیادہ دور نہیں ہے۔

میکسیکو شہر کئی حصوں میں تقسیم ہے اور ہر حصہ کی ایک مخصوص حیثیت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہزاروں سال قبل اس جگہ جہاں میکسیکو بسا ہوا ہے ایک بہت بڑی جھیل تھی لیکن اب اس جھیل کا کوئی نشان باقی نہیں ہے۔

میکسیکو کا سب سے مشہور علاقہ ایمنڈا ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت بھی ہے کیوں کہ یہاں اسپینیوں نے اپنے مظالم کا اڈہ بنا رکھا تھا اور اسی جگہ میکسیکو کے آمر اعظم ڈیاض نے اپنا مرکز قائم کیا تھا۔ اسی علاقہ میں میکسیکو کی سب سے پہلی یونیورسٹی بھی ہے جس میں آج کل تیس ہزار طلباء تعلیم پا رہے ہیں۔ یہیں میکسیکو کے شہیدانِ آزادی کی بھی یادگار قائم ہے۔ اور یہیں امریکہ کا سب سے بڑا اسٹیڈیم بھی ہے۔

میکسیکو کے قریبی پہاڑ پر ایک پرانا قلعہ بھی بنا ہوا ہے جس سے پورا شہر نظر آتا ہے۔ اس قلعہ میں کبھی اسپینی وائسرائے رہتا تھا آج اس قلعے میں فوجی اسکول ہے۔ اسپینی وائسرائے کے بعد شہنشاہ میکسلن نے اس کو اپنی رہائش کے لئے منتخب کیا تھا اور پہاڑ کاٹ کر اپنی آمد و رفت کے لئے ایک چوڑی اور شاندار سڑک بنوائی تھی۔ شہنشاہ میکسیلن کو اس قلعہ میں زیادہ عرصہ تک رہنا نصیب نہیں ہوا تھا کیوں کہ اسپینی مجاہدین

www.taemeernews.com

آزادی نے اس کو گرفتار کر کے اسی قلعے کے سامنے اس کو گولی ماردی تھی اور اس کی ملکہ پر رحم کھا کر اس کو ملک بدر کر دیا تھا۔

آج میکسیکو کی آبادی ۵۲ لاکھ سے زیادہ ہے اور ہر سال اس کی آبادی میں سات فی صدی کا اضافہ ہو رہا ہے۔

یہاں ۱۹۵۷ میں ایک بڑا زبردست زلزلہ آیا تھا جس نے یہاں کی بے شمار عمارتوں کو گرا دیا تھا۔ اب ان عمارتوں کی جگہ پر نئے طرز کی بلند ترین عمارتیں بن گئی ہیں جن سے اس شہر کی خوب صورتی اور عظمت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

میکسیکو میں غیر ملکیوں کی آبادی بہت ہے ایک اندازے کے مطابق صرف اس شہر میں پانچ ہزار امریکی خاندان رہتے ہیں۔ یہاں دنیا کے ہر ملک کے کھانے کے ہوٹل الگ الگ موجود ہیں جن میں غیر ملکی اپنی مرضی کا کھانا کھاتے ہیں اور اس طرح انہیں غیر ملکی ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔

میکسیکو کے طول و عرض میں صرف تیس سال قبل تک تعلیم کا کوئی شوق نہیں تھا لیکن اب حکومت کے خرچ پر ہر بچہ کو پڑھایا جاتا ہے اور ہر سال دو کروڑ کتابیں طلبا میں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ میں نے شہر میکسیکو میں ہر جگہ اسکول اور کالج دیکھے۔ ایک سرکاری افسر نے مجھ سے کہا کہ حکومت ہر سال دو ہزار نئے اسکول قائم کرتی ہے اور تیس فرمیں تمام سال ان اسکولوں کی عمارتیں بناتی رہتی ہیں۔

میکسیکو میں عام زبان اسپینی ہے لیکن اب انگریزی بھی پڑھائی جاتی ہے۔

میں نے اس ملک میں دو تہذیبوں کا سنگم دیکھا ایک تہذیب وہ جو اسپین یہاں لایا تھا اور دوسری یہاں کی مقامی ہندوستانی تہذیب ——— تہذیب کا یہ سنگم لباس بول چال اور رہن سہن میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ میکسیکو میں گانے اور ناچ کا شوق بہت ہے۔ کوئی قصبہ یا کوئی شہر ایسا

میکسیکو کا سب سے پرانا گرجا جہاں روزانہ چراغاں کیا جاتا ہے

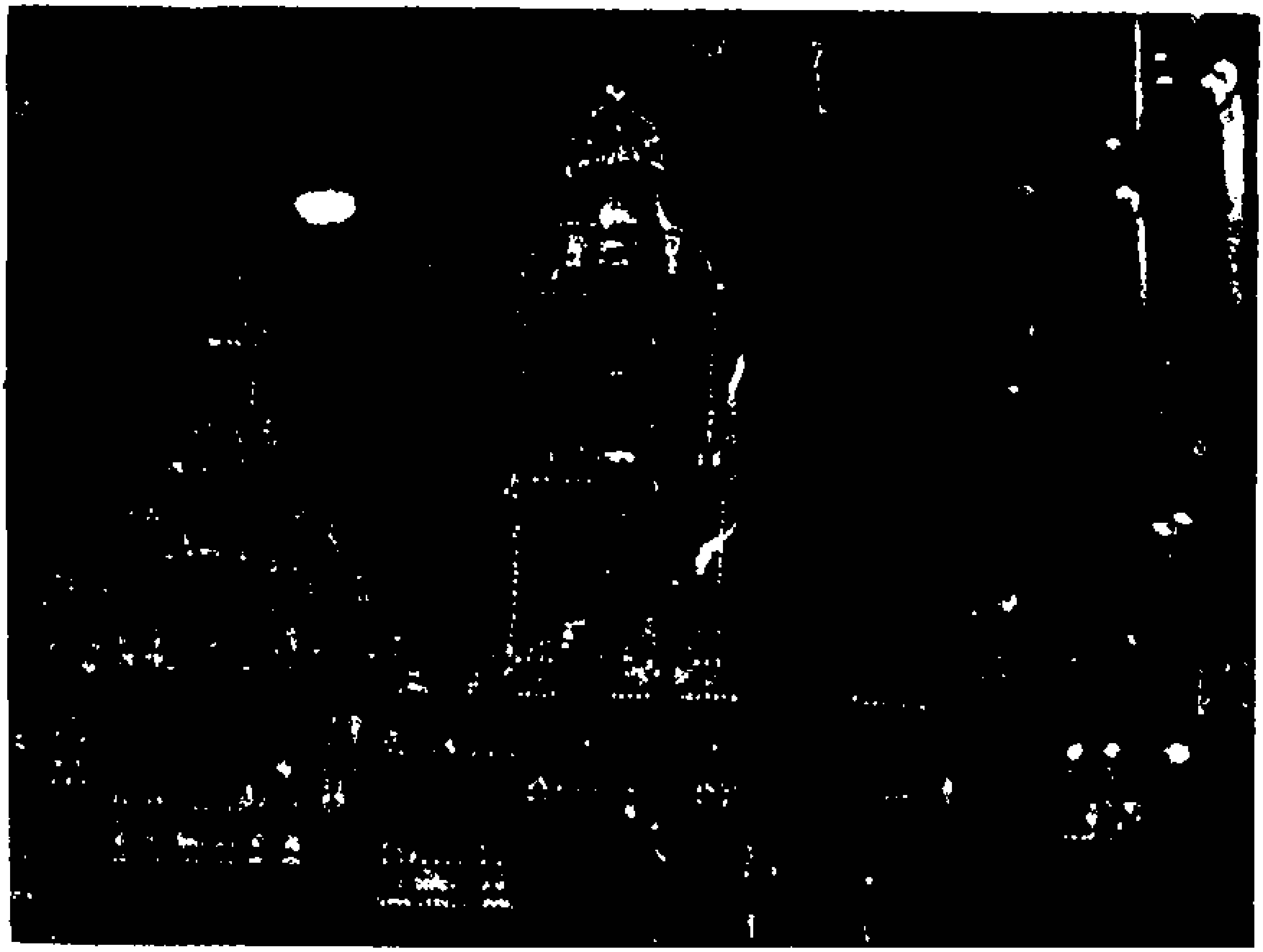

www.taemeernews.com

میکسیکو کے ایک مالدار گھرانے کی بچی

نہیں ہے جہاں ناچنے اور گانے کا تھیٹر اور اسکول نہ ہوں۔ میکسیکو کا رقص اتنا دلچسپ اور رنگین ہوتا ہے کہ میں نے جب بھی رقص دیکھا میں مبہوت رہ گیا۔

قدیم آبادی بھی رقص کی شوقین ہے۔ میکسیکو کی آبادی کا پانچواں حصہ قدیم باشندوں پر مشتمل ہے، یہ لوگ تقریباً سو مختلف قسم کی زبانیں بولتے ہیں۔ ان کے الگ الگ قبیلے ہیں جن کے لباس بھی الگ ہیں۔ ان کے دیہات دیکھنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وقت پیچھے لوٹ گیا ہے۔ یہ احساس ہی نہیں رہتا کہ ہم ۱۹۶۸ میں میکسیکو کا ایک دیہات دیکھ رہے ہیں۔ قبائلی لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور آپس میں ہی مال کا تبادلہ کر لیتے ہیں۔ ان میں سکوں کا استعمال آج بھی بہت کم ہے۔

میکسیکو میں تیل کے لاتعداد کنویں ہیں۔ ۱۹۳۸ء تک تیل کی تجارت غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھی لیکن اسی سال حکومت نے تیل کو قومی ملکیت قرار دے دیا اور اس طرح میکسیکو کی قومی آمدنی میں کروڑوں روپے کا اضافہ ہوگیا۔ حکومت نے اپنی اس نئی آمدنی کا صحیح استعمال بھی کیا۔ اس رقم سے میکسیکو میں سڑکوں کا جال بچھا دیا۔ آج میکسیکو میں ہر جگہ آنے جانے کے لئے بہترین سڑکیں موجود ہیں

میکسیکو کے ایک غریب گھرانے کا بچہ
عمر دو سال
وزن گیارہ پونڈ

جھیل میں تفریح کا منظر

www.taemeernews.com

ایک کسان کا خوش و خرم بچہ

لئے ہے کہ یہاں ۱۸۱۰ میں ایک پادری نے اسپین کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا تھا اور اس پادری کی اپیل پر ہزاروں کسانوں نے بغاوت کر دی تھی۔

اس پادری کو آزادی کا مطالبہ کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا ملی تھی۔ آج اس شہر میں پادری کا مجسمہ نصب ہے۔ اس شہر میں ۱۸۶۷ کو شہنشاہ میکسملن کو گولی سے اڑا دئے جانے کی سزا ملی تھی اور اسی شہر میں ۱۹۱۷ میں ملک کا نیا دستور منظور کیا گیا تھا ـــــ میکسیکو کے عوام اسی لئے اپنے اس شہر کو آزادی کا شہر کہتے ہیں۔ آزادی کے اس شہر میں ۱۹۵۸ء میں ایک بڑا زبردست سیلاب بھی آیا تھا دریا کا باندھ ٹوٹ گیا تھا اور اتنی تباہی پھیلی تھی کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ایک کسان دوشیزہ

میکسیکو میں ایک علاقہ 'عورتوں کا جزیرہ' بھی کہلاتا ہے۔ اس علاقہ کے نام میں اتنی کشش تھی کہ میں وہاں بھی گیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس کو عورتوں کا جزیرہ کیوں کہا جاتا ہے۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ یہ نام اسپینی حاکموں نے رکھا تھا۔ کیونکہ یہاں بڑی خوب صورت عورتیں رہتی تھیں۔ اور یہاں مایا تہذیب کے جو مندر تھے ان میں عورتوں کے ہی بت رکھے تھے۔ اس علاقہ میں زمانۂ قدیم میں عورتوں کی ہی پوجا کی جاتی تھی۔ آج بھی یہاں کی عورتوں میں پریوں کا سا حسن پایا جاتا ہے۔ رنگین لباس میں یہ واقعی آسمانی مخلوق معلوم ہوتی ہیں۔

عورتوں کے جزیرے میں مایا زمانے کے بہت سے مندر ہیں۔ ان میں سے کچھ اب کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے ہیں اور کچھ کی عظمت آج بھی باقی ہے۔ میں نے کئی مندر دیکھے اور میں ان کی تعمیر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ان میں سے بعض مندر دس دس منزلہ ہیں۔

یہاں سے میں 'باجوا' گیا۔ اس شہر کی شہرت اس

www.taemeernews.com

اس علاقہ میں جوار کی کاشت بہت زیادہ کی جاتی ہے۔ جوار کا تذکرہ آیا ہے تو ایک اور واقعہ بھی سُن لیجئے۔ جب شہر میکسیکو میں ایک چوالیس منزلہ مینارِ آزادی کی بنیادیں کھودی گئی تھیں تو زمین کی گہرائی سے جوار کا ایک پودا نکلا تھا اور ماہرین نے اس پودے کی عمر اسّی ہزار سال بتائی تھی۔ میکسیکو میں آج لاتعداد قسم کی جوار اگائی جاتی ہے اور یہاں کے کسان جوار بہت شوق سے کھاتے ہیں۔

میکسیکو میں کاشتکاری کے طریقے کتنے ترقی پذیر ہیں اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہاں ساری دنیا سے کسان طالب علم کاشتکاری کا فن سیکھنے آتے ہیں اور اقوام متحدہ کا غذائی کمیشن ان کی رہائش کا سارا خرچ برداشت کرتا ہے۔ یہاں گیہوں کی پیداوار بڑھانے کے بھی کئی تجربے کئے جا رہے ہیں۔

میکسیکو میں 'پزکارو' نام کے ایک ساحلی شہر میں عام پیشہ ماہی گیری ہے۔ میں یہ شہر بھی دیکھنے گیا کیوں کہ میں نے یہ سُنا تھا کہ یہاں کے بعض ماہی گیروں کے پاس سینکڑوں سال پرانے جال ہیں۔ ان ماہی گیروں میں اکثریت اس ملک کے قدیم باشندوں کی ہے۔ مرد تمام دن سمندر میں مچھلیاں پکڑتے ہیں اور عورتیں مکانوں میں مرغی خانے چلاتی ہیں۔ یہاں اس کثرت سے پولٹری فارم ہیں کہ ہزاروں مرغے روزانہ دوسرے شہروں کو سپلائی کئے جاتے ہیں۔

میکسیکو کے بارے میں یہ بتانا میں بھول گیا کہ وہاں کے کاشتکاروں کو روسی انقلاب سے سات برس پیشتر ہی زمینداروں اور جاگیرداروں کے چنگل سے آزاد کرا دیا گیا تھا وہاں کاشتکار ہی زمین کا مالک ہوتا ہے لیکن اب بھی تقریباً دس لاکھ کسان ایسے ہیں جو حکومت کی طرف سے زمین ملنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ خیال ہے کہ آئندہ دس برس کے اندر

قربانی کے کنویں سے برآمد ہونے والی چیزیں

قربانی کا مندر

www.taemeernews.com

یہ تمام چیزیں کھدائی کے دوران برآمد ہوئی ہیں

ان سب کو بھی کاشتکاری کے قابل زمین مل جائے گی۔

میں نے پورے میکسیکو کی سیر کی اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ہر جگہ غیر ملکی سیاح موجود ہیں۔ میں نے ایک سرکاری افسر سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ کناڈا کے بعد سب سے زیادہ امریکی سیاح میکسیکو آنا پسند کرتے ہیں اور اندازاً ہر سال چھ لاکھ امریکی یہاں سیر تفریح کے لئے آتے ہیں۔ دنیا کے دوسرے ملکوں کے سیاحوں کی تعداد اس سے الگ ہے۔ اس افسر نے یہ بھی بتایا کہ ان سیاحوں سے حکومت کو بہت زیادہ زرِ مبادلہ مل جاتا ہے۔ یہ سیاح سب سے زیادہ قیام 'اکاپلکو' میں کرتے ہیں جو ایک بڑا خوب صورت ساحلی شہر ہے۔ اس شہر میں ہر ہفتہ تقریباً اسی ہزار افراد صرف سیر تفریح کے لئے آتے ہیں اور یہاں کے قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی سیاحت کے دوران دو ہزار میل کا سفر کیا۔ اس دوران میں نے میکسیکو کا بڑے قریب سے مطالعہ کیا اور آج میں یہ لکھنے پر مجبور ہوں کہ میں حتمی طور پر یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ مجھے اس ملک کی کون سی چیز سب سے زیادہ پسند آئی ہے۔ میکسیکو میں مجھے ہر طرف خوب صورتی نظر آئی' ہر طرف انسان کا حسن بھی دکھائی دیا اور قدرت کا بھی۔

میں نے 'ایل پاسو' کی وہ مشہور سرحد بھی دیکھی جہاں سے اس سال لاکھوں آدمی اولمپک کھیل دیکھنے کے لئے داخل ہوں گے اور جوریز بھی دیکھا جہاں انسانوں اور موٹروں کی تعداد برابر ہے۔ میں نے یہاں برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑی چوٹیاں بھی دیکھیں اور بڑے بڑے ریگستان بھی۔ میں نے یہاں میلوں لمبے کھیت بھی دیکھے اور وہ بازار بھی جہاں دنیا کے ہر ملک کا سامان فروخت ہوتا ہے۔ میں نے یہاں میلوں لمبے کھنڈر بھی دیکھے جہاں کولمبس کی امریکی

www.taemeernews.com

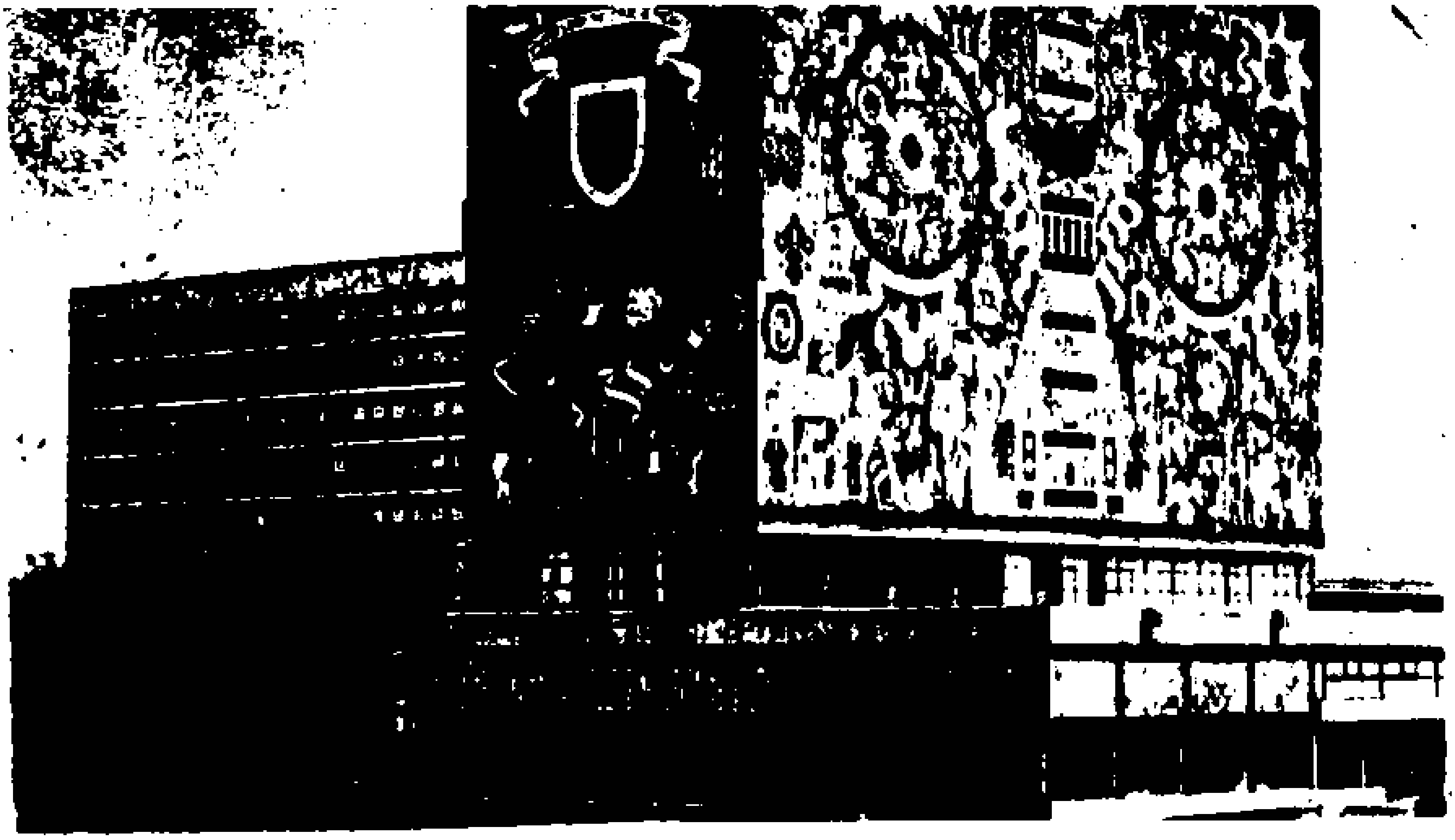

میکسیکو کی عالی شان یونیورسٹی جہاں تیس ہزار طالب علم تحصیل علم میں مصروف رہتے ہیں

دریافت سے قبل انسان رہتے تھے وہ انسان جن کی تہذیب پر پورے جنوبی امریکہ کو ناز ہے۔ میں نے یہاں صدیوں پرانی عمارتیں بھی دیکھیں اور نئے طرز کے بلند و بالا مکان بھی۔

میں نے میکسیکو میں ایک پورے شہر کو ویران اور غیر آباد پایا۔ اس شہر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل یہاں مہذب انسان رہتے تھے۔ یہ سارے انسان کہاں چلے گئے اور یہ شہر کیوں ویران ہو گیا اس کے بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے۔

میں نے میکسیکو میں وہ علاقے بھی دیکھے جہاں صرف غنڈوں کا راج ہے اور جہاں کے مجرموں کے سامنے پولیس بالکل بے بس ہے اور وہ علاقے بھی دیکھے جہاں تہذیب اور تمدن اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتی ہے۔

یہ دو نوجوان اپنے لباس کے اعتبار سے جدید اور قدیم تہذیب کا سنگم نظر آتے ہیں

www.taemeernews.com

میکسیکو کا
ایک قبائلی اپنے قدیم
لباس میں لیکن گٹار
دورِ جدید کا ہے

میں نے میکسیکو میں زندگی کو انتہائی مصروف بھی پایا اور انتہائی بے مصرف بھی۔ میکسیکو واقعی بڑا عجیب وغریب ملک ہے۔

میں نے میکسیکو کے قدیم باشندوں کے بارے میں بڑی عجیب وغریب کہانیاں سنیں، جب مجھے یہ بتایا گیا کہ اسپینی حکمرانوں نے اپنی حکومت کے دوران اسّی لاکھ انسانوں کو برباد کیا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جب مجھ سے یہ کہا گیا کہ قبائلی آبادی میں آج بھی اسّی فی صدی بچے مختلف بیماریوں کا شکار ہو کر مر جاتے ہیں تو میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میں نے دنیا کی سب سے عجیب وغریب خبر سنی ہو۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ایک اٹھارہ مہینے کے بچے کو دیکھا اس کا وزن صرف گیارہ پونڈ تھا۔ میں نے وہاں ایسے انسان بھی دیکھے جو چوہے تک کھا جاتے ہیں اور ایسے قبائلی بھی دیکھے جو اپنے پہاڑی غاروں سے باہر نکلنا ہی نہیں چاہتے۔

میکسیکو میں مَیں نے ایک ایسی ریلوے لائن پر بھی سفر

www.taemeernews.com

کیا بس کے چار سو میل لمبے راستے میں ۸۶ پہاڑی سرنگیں اور اکتیس پل ہیں۔ یہ ریل دنیا کے خوب صورت ترین علاقوں سے گزرتی ہے اور سیاح کو ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں کہ وہ مبہوت ہوکر رہ جاتے ہیں۔

میں نے میکسیکو میں صرف دولت کی ریل پیل ہی نہیں دیکھی میں نے وہاں ایسے انسان بھی دیکھے جن کے پاس نہ پہننے کے کپڑے تھے، نہ کھانے کے لئے روٹی اور نہ رہنے کے لئے مکان۔ میں نے وہاں ایسے ہزاروں قبائلی دیکھے جو آج بھی بالکل ننگے رہتے ہیں اور کچّا گوشت کھاتے ہیں۔

میکسیکو پر چوں کہ صدیوں تک اسپینیوں نے حکومت کی ہے اس لئے ہر زندگی پر اسپینی چھاپ آج بھی موجود ہے بیلوں سے لڑائی کا کھیل اسپین کی طرح یہاں بھی پسند کیا جاتا ہے۔ غصّے میں بھرے ہوئے بیل اور انسان میں لڑائی ہوتی ہے اور ہزاروں انسان اس جنگ کا تماشہ دیکھتے ہیں اور جب کھلاڑی اپنی تلوار سے بیل کو ہلاک کر دیتا ہے تو تالیاں بجا کر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ عوام اس صورت میں بھی تالی بجاتے ہیں جب بیل انسان کو ہلاک کر دیتا ہے۔

میکسیکو میں بڑے بڑے ریگستان بھی ہیں

اپنی اس سیاحت کے دوران میں نے میکسیکو میں مایانسل کی ایک قربان گاہ بھی دیکھی۔ اس مندر میں ایک کنواں ہے جس کے بارے میں آج سے چار سو سال قبل ایک اسپینی پادری نے یہ لکھا تھا کہ قحط سالی کے زمانے میں مندر کے پروہت دیوتا کو خوش کرنے کے لئے اس کنویں میں ایک کنواری لڑکی کو زندہ پھینک دیا کرتے تھے اور جب یہ لڑکی پانی میں ڈوب جاتی تھی تو اوپر سے سونے کے ٹکڑے اور ہیرے جواہرات پھینکے جاتے تھے کنویں کے پاس ایک پرانے مندر کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ اب تک حکومت کی نگرانی میں اس کنویں کی کئی مرتبہ صفائی کی جا چکی ہے لیکن ابھی تک اس سے پورا خزانہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اب تک اس کنویں سے تقریباً پچاس لاکھ ڈالر کا سونا اور ہیرے جواہرات نکل چکے ہیں، قیمتی برتنوں، خوب صورت زیوروں اور بہترین ہتھیاروں کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ کنویں سے نکلنے والی تمام چیزوں کو میکسیکو کے میوزم میں حفاظت کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے۔

میکسیکو کے عوام بڑے زبردست مذہبی ہیں، پورے ملک میں ہزاروں چرچ ہیں۔ چرچ وہاں کی زندگی میں داخل ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مذہبی تقریبوں کے علاوہ قومی اور سیاسی تقریبیں بھی چرچ میں ہی ہوتی ہیں۔ میکسیکو میں سان فرنانڈو کے چرچ میں ہر سال ۱۷ جنوری کو جانوروں کا دن منایا جاتا ہے۔ ہزاروں لوگ اپنے پالتو جانور اور پرندے لے کر وہاں آتے ہیں اور ان پر پادری سے مقدس پانی چھڑکواتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اس طرح ان کے پالتو جانور اور پرندے آئندہ ایک سال تک بیماری سے محفوظ رہیں گے میکسیکو میں ایک چار سو سال پرانا گرجا بھی ہے جس میں ایک اتنا بڑا گھنٹہ لٹکا ہے کہ جب وہ اتوار کو بجایا جاتا ہے تو چھ میل تک اس کی آواز سنائی دیتی ہے۔

www.taemeernews.com

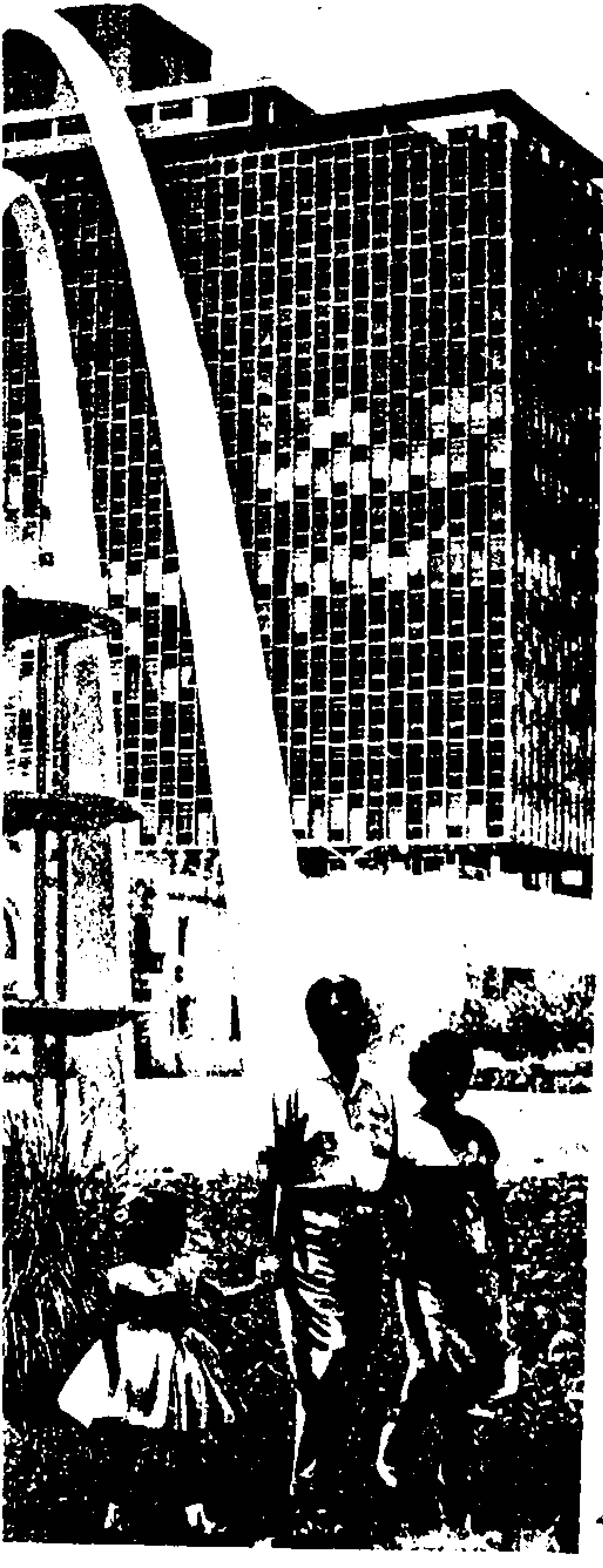

میں میکسیکو شہر کی بہت تعریف کر چکا ہوں لیکن مجھے یہ بھی لکھنا پڑ رہا ہے کہ اس شہر کے بعض علاقے اتنے گندے ہیں کہ شائد دنیا کے کسی شہر میں بھی نہ ہوں گے۔

میکسیکو سے ۲۸ میل جانب مغرب 'ٹوٹی ہاکان' نام کا ایک قدیم شہر بھی ہے۔ یہ شہر کبھی روم سے بھی بڑا تھا' اس میں تقریباً چار ہزار پختہ عمارتیں تھیں اور یہاں دس لاکھ انسان رہتے تھے۔ میں نے اس شہر کے کھنڈر بھی دیکھے یہاں جو اہرام بنا ہے اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر دو ہزار سال قبل ہوئی تھی اور دس ہزار مزدور بیس سال تک اس کی تعمیر میں لگے رہے تھے۔ یہ اہرام بالکل مضبوطی کے ساتھ آج بھی سر اٹھائے کھڑا ہے۔

اولمپک کھیلوں کے شروع ہونے سے قبل ہی میں اپنی سیاحت ختم کر کے میکسیکو واپس پہنچ چکا ہوں۔ اس شہر کے باہر ہی ایک طویل میدان میں جہاں پہلے کھنڈر ہوا کرتے تھے اولمپک گاؤں بن گیا ہے۔ شہر میں کھیل دیکھنے والوں کی آمد شروع ہو چکی ہے۔ اس وقت میکسیکو شہر میں ساری دنیا سے آئے ہوئے بیس لاکھ تماشائی موجود ہیں۔ ساری دنیا کی بہترین ٹیمیں یہاں پہنچ چکی ہیں اور پورا شہر ایک انوکھے قسم کے میلے میں تبدیل ہو چکا ہے۔

میری موجودگی میں ہی دنیا کے ایک سو بیس چھوٹے بڑے ملکوں کی ٹیمیں میکسیکو پہنچ چکی ہیں۔ پورا شہر دلہن کی طرح سجا ہوا ہے۔ ہر شخص چھٹیاں منا رہا ہے اور ہر سڑک پر سیکڑوں غیر ملکی نظر آ رہے ہیں ——— میکسیکو کے حسن میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

میکسیکو میں اولمپک کھیل ہو رہے ہیں' ساری دنیا کی نگاہیں اس وقت میکسیکو شہر پر مرکوز ہیں لیکن میں عالم تصور میں وہ سارا میکسیکو دیکھ رہا ہوں جس کی سیاحت ختم کر کے میں یہاں واپس آیا ہوں' میں ہر وقت یہ سوچتا رہتا ہوں کہ میں میکسیکو کو ایک ملک کہوں یا زندہ عجائب گھر۔

میکسیکو ترقی کی جانب تیزی سے گامزن ہے

www.taemeernews.com

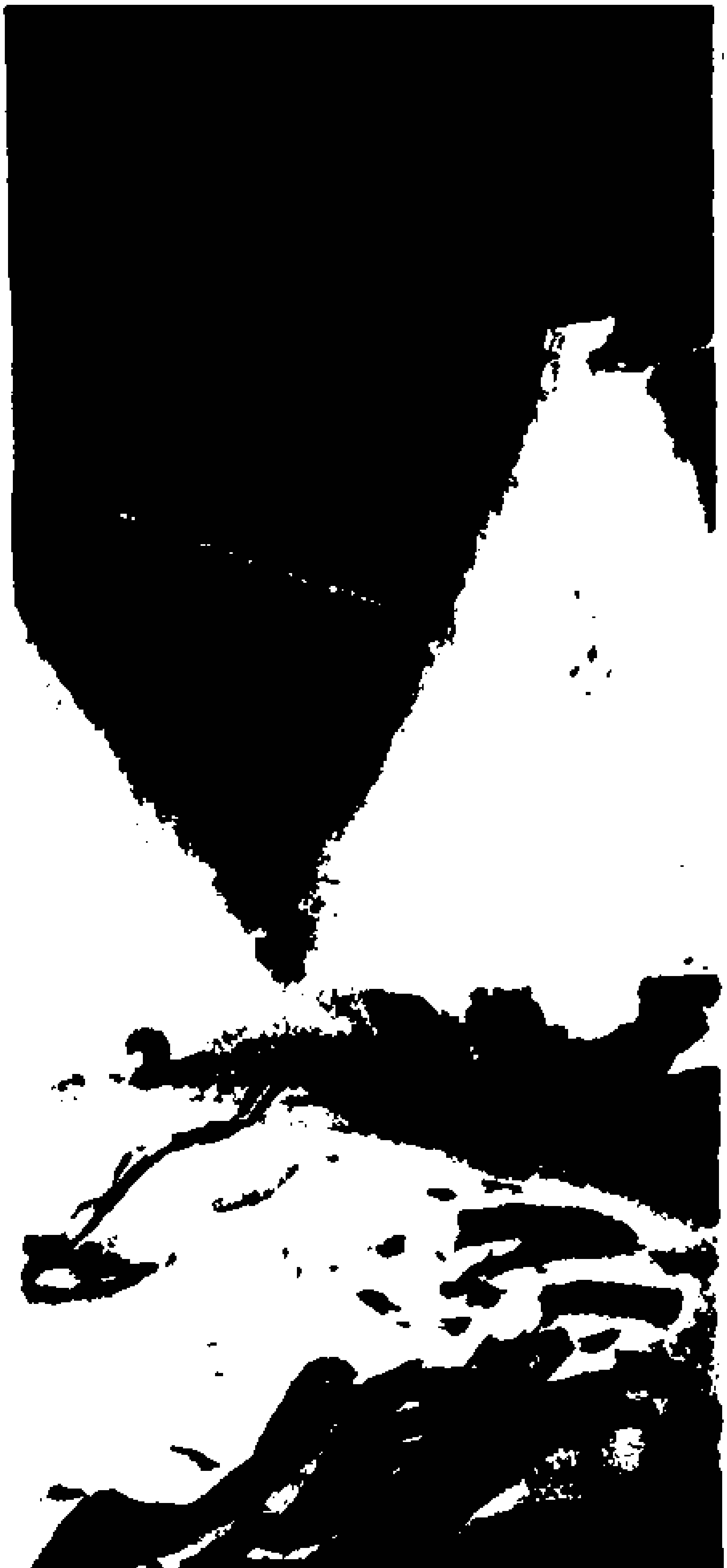

دنیا کی سب سے بڑی

ایٹمی آب دوز سمندر کی تہہ میں غبارے کی طرح پھٹ گئی

جیمس ایچ - ویکلین

ساری دنیا کا فیصلہ تھا کہ اب تباہ شدہ ایٹمی آب دوز "تھریشر" کبھی نہیں مل سکے گی لیکن مسلسل محنت کے بعد بحری فوج کے ماہروں نے اسے تلاش ہی کرلیا۔ سمندر کی تہہ میں آخر کار مل گئی۔

یہ ایٹمی آب دوز آخری بار ۱۵، اپریل ۱۹۶۳ کو صبح ۷ بج کر ۲۳ منٹ پر دلکنس دیپ کے مقام پر سطح آب پر نظر آئی تھی۔ سمندر بالکل ساکت تھا کبھی کبھی ہلکی ہلکی لہریں بلند ہوجایا کرتی تھیں۔ یہ آب دوز ۲۷۸ فٹ لمبی اور تین ہزار سات سو ٹن وزنی تھی۔ دشمن کی تباہی کے لئے یہ انتہائی مہلک ترین آب دوز تھی۔ اس آب دوز پر سے پانی کے اندر ہی سے دشمن پر تباہ کن میزائل پھینکے جا سکتے تھے۔

ایک دن قبل "تھریشر" کم گہرے پانی کی مہم سر کر چکی تھی۔ اس میں ۱۲۹ آدمی موجود تھے اور ۱۵، اپریل کو وہ تقریباً آٹھ ہزار چار سو فٹ گہرے پانی میں بڑی احتیاط سے بڑھ رہی تھی۔ آج یہ اس کی دوسری مہم تھی۔ اس کے قریب ہی بحری فوج کا ایک جہاز اسکائی لارک موجود تھا۔

سات بج کر ۱۵ منٹ پر تھریشر سے یہ اطلاع ملی کہ وہ اسکائی لارک سے صرف چار سو فٹ کے فاصلہ پر ہے اور ملاح اس کو بڑی خوبی سے قابو میں کئے ہوئے ہیں۔ دو

www.taemeernews.com

منٹ بعد اسکائی لارک نے محسوس کیا کہ تھریشر اپنی امتحانی گہرائی میں پہنچ چکی ہے لیکن ـــــ آٹھ بج کر ۲۵ منٹ پر تھریشر سے یہ اطلاع ملی کہ وہ امتحانی گہرائی سے ابھی تین سو فٹ اُوپر ہے۔ آٹھ بج کر ۵۳ منٹ پر اطلاع پہنچی کہ اب وہ زِامتحانی گہرائی کے قریب پہنچ رہی ہے۔ نو بج کر ۳۵ منٹ پر اطلاع پہنچی کہ "تھریشر کچھ معمولی اُلجھنوں سے دوچار ہو گئی ہے اور اب ہمارا نشانہ بالکل سیدھا اُوپر کی جانب ہے۔"

اس کے بعد تھریشر سے اور کوئی پیغام نہیں ملا۔ نو بج کر ۱۷ منٹ پر اسکائی لارک کے کمانڈر نے تھریشر کے

www.taemeernews.com

بد نصیب آب دوز کا ایک حصہ

سگنلر سے پوچھا "کیا تھریشر قابو میں ہے؟" اسے اس کا جواب نہیں ملا۔ اب کمانڈر کے کانوں میں ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز آئی ____ اس نے سوچا شاید یہ پانی کی بربراہٹ ہے لیکن ____

اس کے بعد دو گھنٹے تک اسکائی لارک نے اس علاقے کے کئی چکر لگائے اور تھریشر کے لئے ہر منٹ پر پیغام بھیجے لیکن تھریشر کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اب کمانڈر نے گھبرا کر بحری فوج کے ہیڈ کوارٹر کو اس صورتِ حال سے مطلع کر دیا ____ چار بجے صدر کینیڈی کو بھی یہ اطلاع دے دی گئی۔

شام کو چیف نیوی آپریشن نے واشنگٹن میں اپنے افسروں کا ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا اور یہ کہا "کسی جہاز کے ڈوبنے کی اطلاع پا کر اسے نہ بچانا بہت ہی افسوس ناک بات ہے اور اب تو اسکائی لارک کے گرد پانی کی سطح پر پلاسٹک اور کارک کے ٹکڑے اور تیل وغیرہ بھی نظر آ رہا ہے۔"

دوسرے ہی دن اٹلانٹس نام کا ایک جہاز بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس جہاز پر ماہرین کی ایک جماعت موجود تھی، تھریشر کو ہر حال میں تلاش کرنا تھا۔ ایک ہفتہ کے اندر ستارہ جہاز اور پہنچ گئے۔ تلاش کرنے والوں کو یہ پلاسٹک کے ٹکڑے اور پیلے رنگ کے دستانے مل گئے۔ ایک غوطہ خور نے آبدوز کے ملاحوں کے خصوصی لباس کا ایک ٹکڑا بھی پا لیا لیکن ابھی تھریشر کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔ چند سائنس دانوں کی رائے تھی کہ تھریشر سمندر کی تہہ میں ڈوب چکی ہے اور اکثر ماہرین کا خیال تھا آب دوز کسی چٹان سے ٹکرا گئی ہے۔

اب تلاش کی مہم اور بھی زیادہ تیز کر دی گئی۔

۲۶ اپریل کو امریکی بحری فوج نے اعلان کیا کہ اس مقام پر سمندر کی تہہ میں چھ مختلف مقامات پر پھپھولے سے بنے ہوئے ہیں اور ایک تو بالکل تھریشر کا سا ہے۔ کیمرے سے ان کی تصویریں لی گئیں اور ان پھپھولوں کی تحقیق کے لئے کئی طرح کے برقی آلات استعمال کئے گئے۔ ۱۶ مئی کو کیمرے کی مدد سے دھات کی ایک چادر کا ایک پھٹا ہوا ٹکڑا دیکھا گیا۔ اٹلانٹس کے غوطہ خوروں نے تہہ سے آکسیجن کی ایک بوتل برآمد کی اور تہہ میں ایک کتاب دیکھی ____

اب یہ یقین ہو گیا کہ یہ سب ثبوت تھریشر کی تباہی کے ہی ہیں۔

۲۴ جون سے دنیا کے بہترین غوطہ خور مسلسل ایک ہفتے تک غوطے لگاتے رہے اور ایک غوطہ خور نے ری ایکٹر کمپارٹمنٹ میں پہنے جانے والا پلاسٹک ____ کا ایک جوتا ڈھونڈھ لیا۔ اس جوتے پر ایس ایس۔ پانچ لکھا ہوا تھا۔

اگست میں غوطہ خوروں نے تلاش کی دوسری مہم شروع کی۔ اس مرتبہ غوطہ خوروں کو بیٹری کی پلیٹیں اور پھٹے ہوئے پائپ مل گئے۔ اسی اثناء میں ایک غوطہ خور

www.taemeernews.com

نے ایک بیس فٹ بڑا دہلانوں والا ٹکڑا تلاش کر لیا۔
بعد میں پتہ چلا کہ اس پرزے کو ۲۵ فٹ لمبا ہونا چاہئے تھا۔
دوسرے دن ایسے کئی ٹکڑے ڈھائی سو گز کے رقبے میں بکھرے ہوئے نظر آگئے۔

ایک ہفتہ بعد ایک بڑا پائپ مل گیا اور یہ تصدیق بھی ہوگئی کہ یہ پائپ تھریشر کے ری ایکٹر کمپارٹمنٹ کا ہے ——— آج غوطہ خوروں نے تھریشر کو سمندر کی تہہ میں دھنسے ہوئے ایک کھر کھرے پتھر کی طرح پا لیا لیکن ابھی

آب دوز کے ہوا کی گردش کے نظام میں ایک پیچ نہیں بڑی گئی تھی لیکن ایک اعلیٰ فوجی افسر نے محض اس غلطی کی بنیاد پر تھریشر کی تباہی ماننے سے انکار کر دیا چنانچہ تھریشر کا مقدمہ ایک اسپیشل کورٹ کے سپرد کر دیا گیا۔ عدالت نے مکمل سماعت کے بعد سترہ سو صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ تیار کی اور ایک سو بیس افراد کی شہادت لی۔ عدالت نے تھریشر کی تباہی کا سبب ایک پائپ کا پھٹنا بتایا اور یہ لکھا کہ یہ پائپ ذرا زیادہ کسا ہوا تھا۔

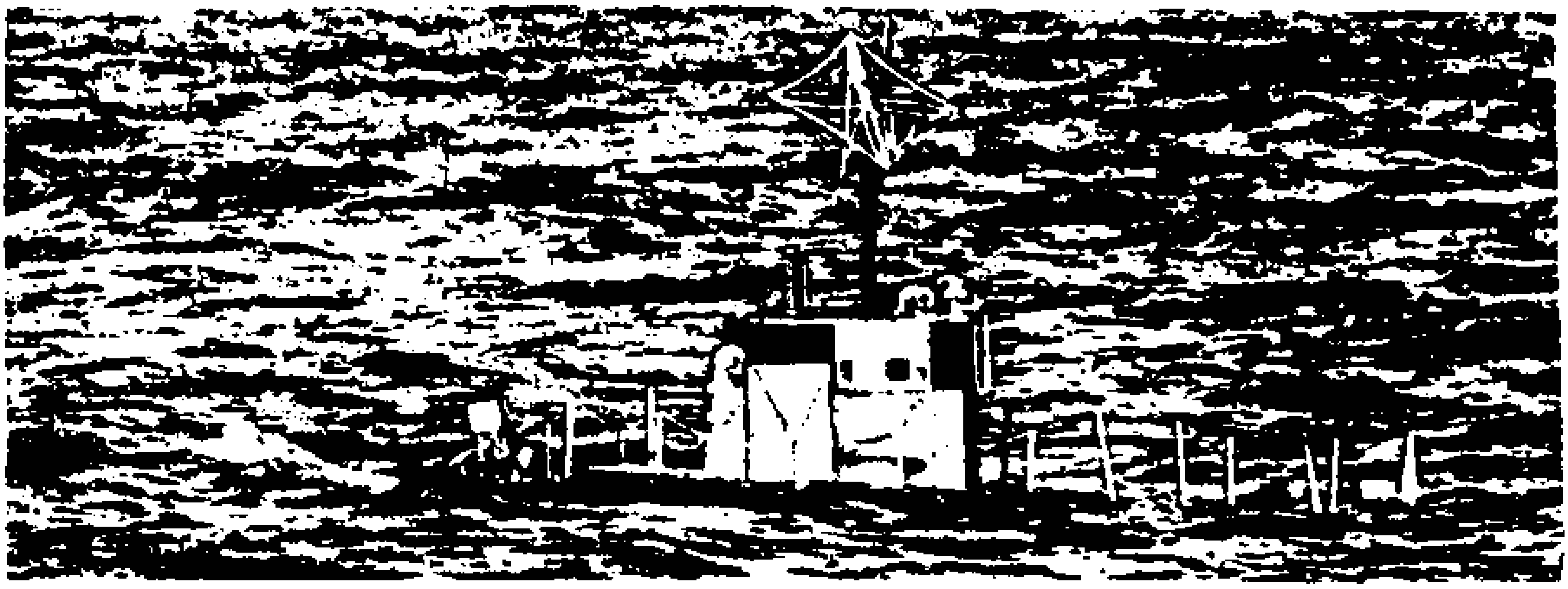

تھریشر کو تلاش کرنے کے لئے ٹرایسٹی نام کی اس آب دوز سے کام لیا گیا

تک ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملا تھا کہ دنیا کی یہ سب سے بڑی جدید ترین آب دوز کیسے تباہ ہوئی؟ کیا کسی دشمن کا ہاتھ تو اس کی تباہی میں نہیں تھا۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ شاید کسی ملاح کی بھول چوک سے یہ تباہی پھیلی ہو۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔

اب اس کی تباہی کا سبب معلوم کرنے کے لئے باقاعدہ ایک کمیشن قائم کر دیا گیا۔ اس کمیشن نے جہاز ساز کمپنیوں اور دوسرے بحری مرکزوں میں کارکنوں کی غلطیوں کا جائزہ لیا اور جلد ہی یہ بات معلوم ہوگئی کہ اس بدنصیب

مزید تحقیقات کے بعد نیوی کے ماہرین نے بھی ایک رپورٹ تیار کی اس میں لکھا تھا "تھریشر کا ایک پائپ ڈھیلا تھا جس کی وجہ سے پانی کا دباؤ اس پر اثر انداز ہوا اور سمندر کا پانی پائپ میں داخل ہو گیا۔ نو بج کر بارہ منٹ پر تھریشر میں کوئی چیز ٹوٹی اور پھر وہ آب دوز ایک غبارے کی طرح پھٹی اور بکھر گئی ———"

امریکہ آج تک ایسی دوسری آب دوز نہیں بنا پایا ہے۔

www.taemeernews.com

صلاح الدین کا قلعہ

مطلوب احمد

قلعہ صلاح الدین کو دیکھ کر آج بھی سیاح حیرت میں رہ جاتا ہے۔

پہلے اس کا نام قلعہ صہیون تھا۔ عیسائیوں نے اپنے دور حکومت میں اس کی جنگی اہمیت کے پیشِ نظر اس کے استحکام کی طرف خصوصی توجہ دی اور پورے بیس سال تک مسلسل اس کی تعمیر میں لگے رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس قلعہ کو ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا مگر جب سلطان صلاح الدین نے اسے صرف چار دنوں میں فتح کر کے پوری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا تو لوگوں نے اسے قلعہ صلاح الدین کہنا شروع کر دیا۔

یہ مشہور تاریخی قلعہ دو فلک بوس پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ پہلے ایک پہاڑ پر چڑھنا پڑتا ہے پھر اس سے اتر کر دوسرے پہاڑ کی چوٹی تک جانا پڑتا ہے تب کہیں جا کر قلعہ کا دروازہ نظر آتا ہے۔ اس قدر جان لیوا مشقت کے باوجود روزانہ ہزاروں سیاح دور دراز کے علاقوں سے اسے دیکھنے آتے ہیں۔ اس قلعہ کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غضب ناک شیر غصے سے سر جھکا کر اپنے شکار پر بس چھلانگ لگانے ہی والا ہے اور انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے کہ آج سے تقریباً دس صدی پہلے کے انسان نے اس قدر مضبوط اور مستحکم قلعہ کیسے تعمیر کر لیا۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ کو بیچوں بیچ کاٹ کر

قلعہ کا بیرونی منظر

ح، ابھی ہمیں صرف اُن انسانوں کا پتہ چل پایا ہے
اس علاقہ کے پہاڑی غاروں میں باقاعدہ مکان
کر تقریباً سات سو سال قبل رہتے تھے لیکن کچھ
کہا جا سکتا کہ یہ ساری آبادی کیسے

قلعہ کی ناقابلِ تسخیر فصیل

قلعہ کے اندرونی کمرے

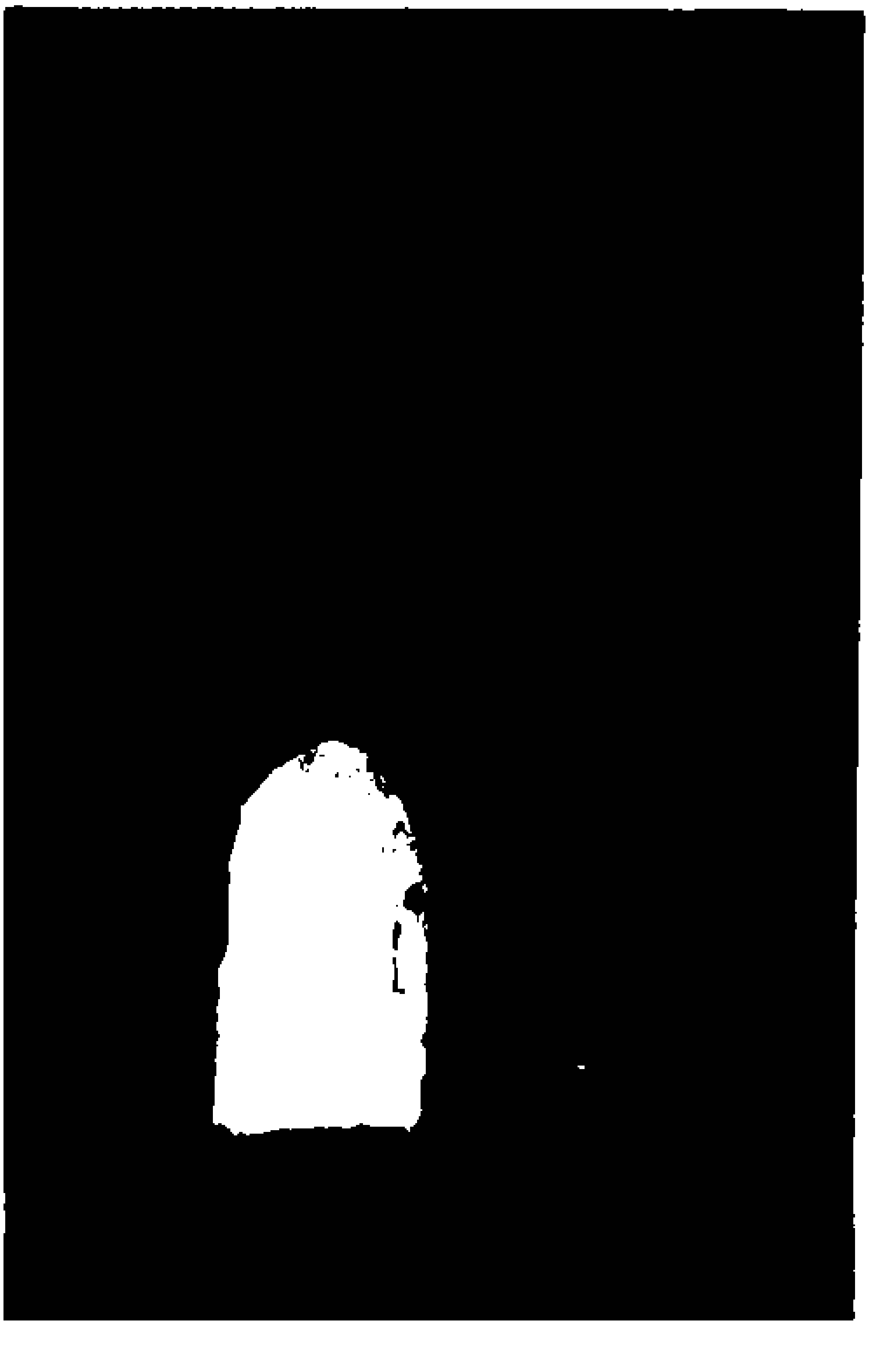

دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کو ۱۵۶ میٹر لمبی اور ۱۷ میٹر چوڑی سرنگ کے ذریعہ ملا دیا گیا۔ قلعہ میں آمد و رفت کے لئے ایک لکڑی کا پُل تیار کیا گیا تھا جسے بوقتِ ضرورت قلعے کی داہنی جانب سے پہاڑ پر لگا دیا جاتا اور ضرورت ختم ہونے کے بعد اسے اٹھا دیا جاتا جب یہ پُل اٹھا دیا جاتا تو قلعہ والوں کا باقی دنیا سے رشتہ بالکل ختم ہو جاتا۔ اس قلعہ کو بہت ہی اونچی اونچی اور مضبوط دیواریں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں اور کئی صدیاں گذر جانے کے بعد بھی یہ دیواریں آج تک جوں کی توں باقی ہیں' ان دیواروں سے ملی ہوئی گہری گہری پانی کی خندقیں ہیں۔ قلعے کے قریب ہی شام کے پانچ گاؤں قموحیہ' جدید' خدلو' منیرہ اور کریک واقع ہیں جن کے باشندے گیہوں' سیب اور زیتون کی کاشت کرتے ہیں۔ قلعے میں ایک خفیہ دروازہ بھی تھا' جسے حفاظت کے پیشِ نظر ہمیشہ درختوں اور جھاڑیوں وغیرہ سے بند رکھا جاتا۔ اس قلعے کی تعمیر بہت ہی بڑے بڑے پتھروں سے کی گئی تھی۔ کوئی بھی پتھر ایک مکعب میٹر سے چھوٹا نہیں تھا اس قدر بڑے بڑے پتھروں کو بالکل اسی طرح سے ایک دوسرے پر جما کر رکھا گیا ہے جس طرح سے قدیم مصریوں نے اہرامِ مصر کے پتھروں کو ایک دوسرے پر جما کر رکھا ہے۔ اس میں قید خانہ، عورتوں اور مردوں کے لئے الگ الگ حمام اور بارش کا پانی جمع کرنے کے لئے ایک پختہ تالاب تعمیر کیا گیا تھا۔ قلعہ کے اوپر متعدد برج اور دشمنوں کی نقل و حرکت کو دیکھنے کے لئے بہت سے مراکز بنائے گئے تھے اور اس کے بالکل وسط میں ایک چھوٹا سا چرچ بھی تھا جسے اسلامی فتح کے بعد مسجد میں تبدیل کر دیا گیا۔

"آخر اس قدر مضبوط اور ناقابلِ تسخیر قلعہ کو سلطان صلاح الدین نے کیسے فتح کر لیا؟" ایک سیاح نے ستر سالہ

www.taemeernews.com

مطلوب احمد

قلعہ اتنا عظیم
اور پرشکوہ ہے
کہ آج بھی
سیاح اس کو دیکھ کر
دم بخود
رہ جاتے ہیں

گائڈ سے پوچھا۔ یہ گائڈ فرانسیسی استعمار کے خلاف جدّوجہد آزادی کے سلسلے میں کئی بار قید و بند کی صعوبتیں جھیل چکا تھا اور اب آخیر عمر میں سیاحوں کو اپنے ملک کی روشن تاریخ بتانے کا فرض انجام دینے پر مامور تھا۔ اس گائڈ نے قلعہ سے متصل پہاڑ کی چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ" سلطان صلاح الدین اس پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گیا اور قلعہ میں بند عیسائیوں پر چار روز تک مسلسل پتھروں اور تیروں کی بارش کرتا رہا جس کے نتیجے میں عیسائیوں کی قوتِ مدافعت کمزور ہوئی۔ سلطان کی فوجوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً ہی پہاڑ سے قلعہ تک پل تیار کرلیا اور آن کی آن میں وہ قلعہ کی بیرونی دیواروں تک پہنچ گئے اور پھر رسیوں کی مدد سے وہ قلعہ کے اوپر چڑھ گئے پھر قلعے کے اندر زبردست جنگ ہوئی اور آخرکار عیسائیوں کو زبردست نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔

سب سے پہلے اس قلعے کو دسویں صدی ہجری میں بازنطینیوں نے تعمیر کیا تھا۔ انہوں نے ایک عظیم الشان برج تعمیر کرکے اسے دو بہت ہی مضبوط دیواروں سے گھیر دیا اور اس کے اندر کئی عمارتیں بنائیں پھر جب بارہویں صدی میں عیسائی آئے تو انہوں نے چودہ برج بنائے جن میں سے ہر ایک کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی پچیس پچیس میٹر تھی

اور ان کی دیواروں کی موٹائی ساڑھے پانچ میٹر تھی۔ عیسائیوں نے اس قلعے کے اندر ایک عظیم الشان محل بھی تعمیر کیا تھا جس کے کنارے کنارے فوجی بارکیں، گھوڑوں کے اصطبل، چرچ، گودام، تندور اور تیل نکالنے کی کلیں تھیں۔

عیسائیوں کے بعد عرب آئے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی شام کے ساحلی علاقوں اور لاذقیہ شہر کو فتح کرتے ہوئے

تک، ابھی ہمیں صرف اُن انسانوں کا پتہ چل پایا ہے جو اس علاقہ کے پہاڑی غاروں میں باقاعدہ مکان بنا کر تقریباً سات سو سال قبل رہتے تھے لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ساری آبادی کیسے ختم ہوگئی۔ [illegible] ہیں۔ اس کی دیواروں کے نیچے سے یورپ کی فوجیں بھی گزری ہیں اور تمام

قلعہ ایک پہاڑی پر بنا ہے

داخلی دروازے کا منظر

۲۴ جولائی کو اس قلعہ پر حملہ آور ہوئے اور چار روز کی خون ریز جنگ کے بعد اس پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد یہ قلعہ چودھویں صدی تک عربوں کے قبضہ میں رہا۔ اسے فتح کرنے کے بعد عربوں نے اس میں متعدد عمارتیں بنائیں عالی شان مسجدیں، غسل خانے اور برج تعمیر کئے۔ عربوں کا تعمیر کردہ ایک برج قصر البنات کے نام سے آج تک مشہور ہے جسے محکمہ آثار قدیمہ نے آج کل سیاحوں کے لئے ریسٹ ہاؤس بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ شامی حکومت پہاڑوں کو کاٹ کر ایک پختہ سڑک بھی بنا رہی ہے تاکہ قلعہ

عرب ملکوں کے سپاہی بھی۔ اس قلعہ کی محرابوں نے اپنے چاروں طرف لاشوں کے انبار بھی دیکھے ہیں اور خون کا دریا بھی بہتے دیکھا ہے۔

اس قلعے نے کئی تہذیبوں کا مشاہدہ کیا ہے ــــ کئی طاقتوں کے عروج و زوال کا تماشہ دیکھا ہے۔ یہ قلعہ ایک مکمل تاریخ ہے۔ ایک عبرت ناک تاریخ جس کے ہر صفحہ پر مقصد کی خاطر جان دینے کی بے شمار کہانیاں لکھی ہوئی ہیں۔

قلعہ صلاح الدین دیکھے بغیر عربوں کے ماضی کے بارے میں کوئی مکمل تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ☪ ☪

www.taemeernews.com

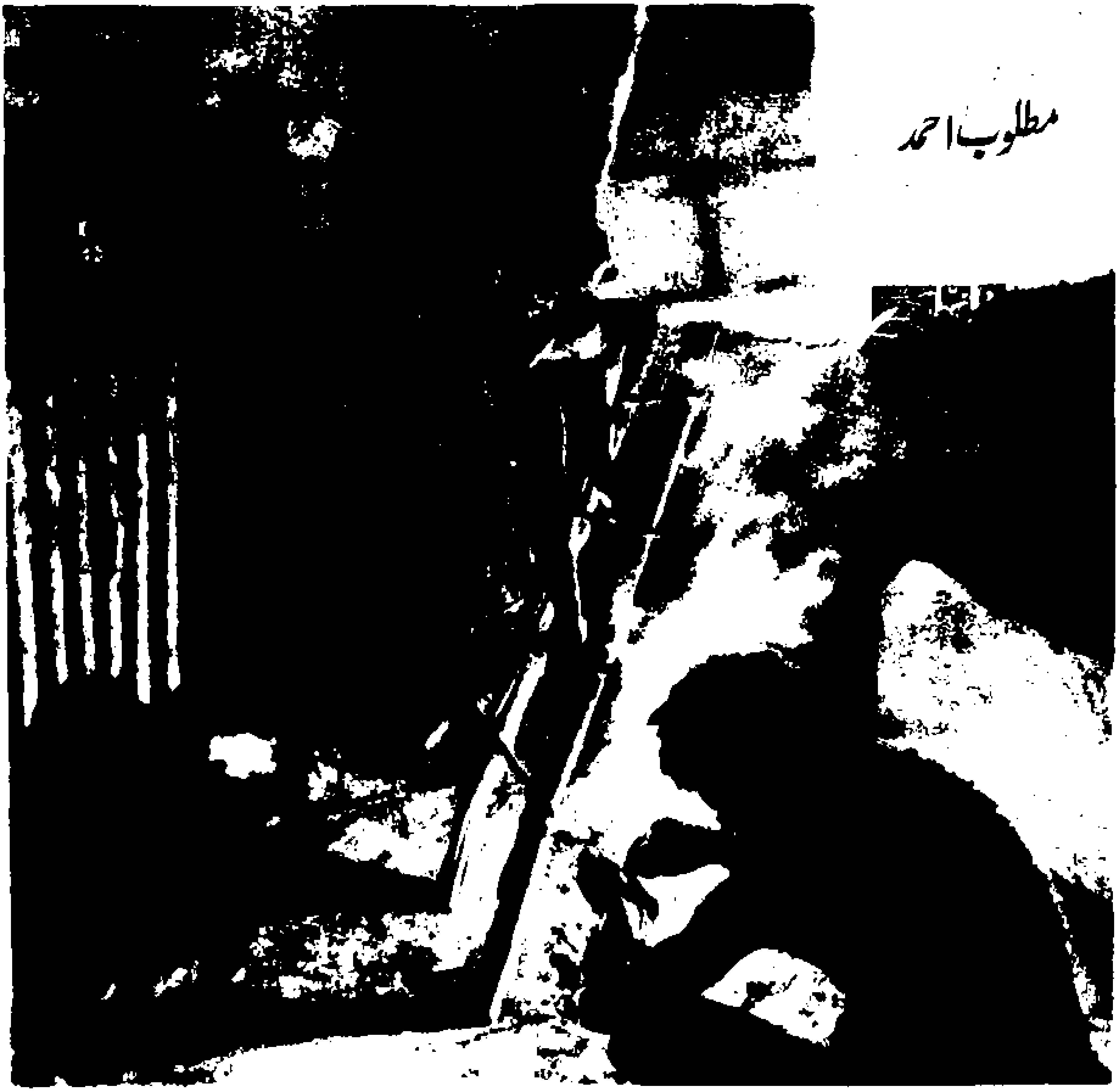

جوزف برکلے

یہ امریکی تہذیب دفن ہو گئی تھی

آج ہمیں کلارڈو کے اس علاقہ کی کھدائی کرتے ہوئے پورے پانچ سال ہو چکے ہیں۔ کبھی اس علاقہ میں امریکہ کے وہ قدیم باشندے رہتے تھے جن کی نسل اب تقریباً ختم ہو چکی ہے لیکن جن کی تہذیب اور تمدن کے نشان اب بھی زمین کی گہرائیوں میں دفن ہیں۔ ہم نے کھدائی کے بعد پہاڑوں کی چٹانوں میں ان کے مکانات بھی تلاش کئے اور زیر زمین ان کی بستیاں بھی۔ ان کھدائی کے دوران ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج سے ہزاروں سال قبل یہ انسان کس قسم کی زندگی بسر کرتے تھے، ان کی خوراک کیا تھی، ان

www.taemeernews.com

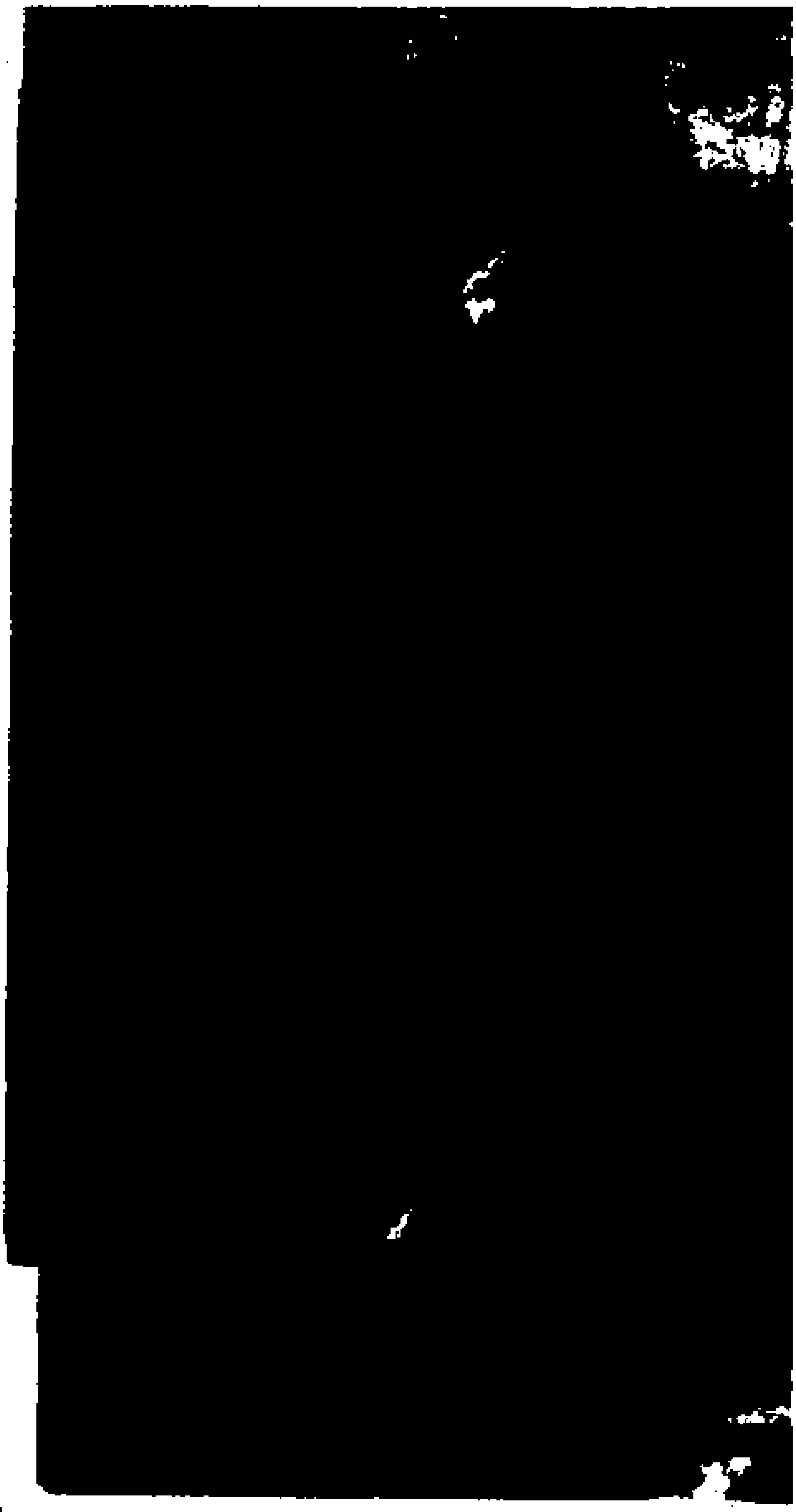

ہیں، ابھی ہمیں صرف اُن انسانوں کا پتہ چل پایا ہے جو اس علاقہ کے پہاڑی غاروں میں باقاعدہ مکان بنا کر تقریباً سات سو سال قبل رہتے تھے لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ساری آبادی کیسے غائب ہوگئی اور اس کا نام و نشان کیسے مٹ گیا۔

یہ انسان یا تو زمین کے اندر چوہے کے سے بِل بنا کر رہتے تھے اور یا پہاڑ کے ترشے ہوتے غاروں میں — یہ لوگ سیڑھیوں کا استعمال بھی جانتے تھے اور کپڑا بننا بھی، — آج یہ پہاڑیاں جن کو "میسا ورڈا" کہا جاتا ہے پوری دنیا کی نگاہوں کا مرکز بن چکی ہیں اور گزشتہ پانچ سال میں تقریباً ۲۴ لاکھ انسان ان پہاڑی غاروں اور زیر زمین بستیاں دیکھنے آ چکے ہیں۔

"میسا ورڈا" میں پہاڑ کے اندر ایک ترشا ہوا محل ہے جہاں تقریباً دو سو کمرے بنے ہیں۔ ایک ——

میسا ورڈا کے انسانوں کے نسل کی دو زندہ عورتیں

اندازے کے مطابق اس محل میں تقریباً چار سو انسان ضرور رہتے تھے۔ خیال ہے کہ ابھی ہمیں ان پہاڑوں میں اور بھی کئی محل ضرور ملیں گے۔ اس محل میں ہیں

کا رہن سہن کیا تھا۔ ان کی معاشرت کیا تھی اور ان کی غذا کیا تھی؟

یقیناً یہ سارے انکشافات ساری دنیا کے لئے حیران کن ہیں۔

اس کھدائی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ امریکہ میں ہزاروں سال پہلے بھی انسان آباد تھا اور صرف آبادی ہی نہیں تھا، اس کی ایک تاریخ بھی تھی —— لیکن ابھی ہم زمانہ قبل از تاریخ تک نہیں پہنچ پاتے

www.taemeernews.com

کھانے اور پکانے کے ہزاروں برتن ملے۔ ایک سے ایک خوب صورت ایک سے ایک حسین ——

کھدائی کے دوران ہمیں زیرِ زمین ایک مکان ملا —— اس مکان کے ایک کمرے میں ہمیں چٹائی کے اندر لپٹی ہوئی ایک آٹھ سالہ لڑکی کی لاش بھی ملی ہم اس مکمل لاش کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لاش کے پاس ہی ایک مرغی کا ڈھانچہ بھی پڑا تھا۔ شاید یہ مرغی اس بچی کی خوراک کے لئے اس کے ساتھ ہی دفن کردی گئی ہوگی۔ چٹائی کے اندر ایک کمبل بھی رکھا ہوا تھا، اور یہ کمبل اس امر کا ثبوت تھا کہ اس زمانے میں یہاں کے رہنے والے اون کا کمبل بنانا بھی جانتے تھے۔

ہمیں یہاں جو انسانی ہڈیاں ملیں ان سے ہمیں یہ اندازہ ہوا کہ یہاں اسی نسل کے لوگ رہتے ہوں گے جو زمانۂ قدیم میں میکسیکو اور اریزونا چلے گئے تھے ان دونوں ملکوں میں اناسازی نسل کے لوگ اب بھی پائے جاتے ہیں —— بہرحال یہ 'اناسازی' انسان متمدن تھے۔ شکار کھیلتے تھے اور کھانا پکانا جانتے تھے۔ یہ لوگ درخت کی شاخوں اور پتوں سے ٹوکریاں بنانا بھی جانتے تھے۔ انہوں نے پتھروں کو تراش کر پہاڑوں کے اندر ہی اندر اپنے لئے مکان بنائے تھے، تاکہ جنگلی جانوروں اور اپنے قبائلی دشمنوں سے محفوظ رہیں۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ تاریخ اس مسئلہ پر خاموش ہے کہ یہ انسان کہاں چلے گئے؟ اور انہوں نے اپنی یہ خوب صورت بستیاں کیوں خالی کردیں؟ کیا ان میں خانہ جنگی ہوگئی تھی یا کسی دشمن نے ان پر حملہ کیا تھا۔ بہرحال یہ ایک یقینی امر ہے کہ وہ پہلے کھلے میدان میں رہتے تھے اور اس کے بعد انہوں نے اپنے کسی دشمن کے خوف سے

www.taemeernews.com

پہاڑی غاروں میں اپنے مکانات بناتے ۔

ان انسانوں کے یہ مکانات بلند پہاڑوں پر بالکل اندر ایک غار کی صورت میں بنے ہوتے ہیں — عقل آج بھی حیران ہے کہ یہ لوگ اتنے بلند پہاڑوں پر روزانہ کیسے چڑھتے اترتے ہوں گے جب کہ آج بھی ترقی کے موجودہ دور میں یہاں کی آمد و رفت انتہائی دشوار اور صبر آزما معلوم ہوتی ہے ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمیں یہاں جو انسانی ہڈیاں ملی ہیں ان میں ایک بھی ہڈی ٹوٹی ہوئی نہیں ہے جو یہ ثابت ہوتا کہ ان میں کوئی آدمی کبھی پہاڑ کی بلندی سے گرا بھی ہوگا ۔

ہمارا اندازہ ہے کہ غالباً تیرہویں صدی میں یہ آبادیاں بالکل ویران ہوگئی تھیں اور سناسازی قبیلہ بالکل معدوم ہوگیا تھا ۔

ہم نے اب تک جو تحقیقات کی ہے اس سے ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ یہ قبیلہ کپڑا بننا جانتا تھا ، برتن بنانا جانتا تھا ، فنِ تعمیر سے واقف تھا ، کھیتی باڑی کرنے میں ماہر تھا ، پانی کو محفوظ کرنے کا طریقہ جانتا تھا ۔

ہمارے لئے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ یہ قبیلہ معدوم کیسے ہوگیا ؟

دو سال تک ہم اس مسئلہ پر بھی تحقیق کرتے رہے اور آخر ہمیں میکسیکو میں اس قبیلہ کی نسل کے انسان بھی مل گئے ۔ ان کی ہڈیوں کی ساخت بھی ان ہڈیوں سے بالکل مشابہ تھی جو ہمیں میسا پہاڑیوں میں ملی تھیں اور ان کے برتن بھی ویسے ہی تھے ۔

اب اس قبیلے کے صرف چند سو لوگ میکسیکو میں موجود ہیں اور یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انسان کبھی ختم نہیں ہوتا ہے ۔ اس کی معاشرت ہمیشہ باقی رہتی ہے ۔ اس کی

غار کے اندر مکان کا دروازہ

تہذیب کے نشان کبھی فنا نہیں ہوتے ۔

میکسکو کے اس قبیلے کے بڑے بوڑھوں سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ صدیوں پیشتر ان کے وطن میں قحط پڑ گیا تھا اور ان کے آباؤ اجداد وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے تھے ۔ اس طرح ہمیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ میسا پہاڑیاں کیوں ویران ہوگئیں ۔

امریکہ کی میسا پہاڑیاں پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ یورپ کی اقوام کی آمد سے قبل بھی امریکہ میں تہذیب تھی لیکن زمانہ ماضی کی اس کھوئی ہوئی تہذیب اور ہماری تہذیب میں فرق یہ ہے کہ وہ تہذیب پر سکون تھی اور ہماری تہذیب جان لیوا ہے ۔ میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں کہ زمانہ ماضی کی یہ دنیا کتنی حسین تھی اور اس میں انسان کو روح دل اور دماغ کا کتنا سکون حاصل تھا ۔

اے کاش ہمیں ہماری یہ گم گشتہ دنیا واپس مل جاتے ۔

www.taemeernews.com

جنیفر مارلے

وہ ۶۳ سال تک اپنے وطن کے لیے لڑتا رہا

دنیا میں بعض انسان ایسے بھی ہوتے ہیں جنکی داستان ایک یادگار بن جاتی ہے۔

۱۴ نومبر ۱۹۱۴ کو یا پرس کے میدان جنگ میں برطانوی موروں کے پیچھے ایک ۸۲ سالہ بوڑھا موت کی ہچکیاں لے رہا تھا — یہ بوڑھا انسان اپنے فوجیوں میں 'بابس' کے نام سے پکارا جاتا تھا اور شائد ونگٹن کے بعد فوجی افسروں میں سب سے زیادہ مشہور افسر تھا۔ گزشتہ ۶۲ سال سے وہ اپنے ملک کے لئے جنگیں لڑ رہا تھا اور اس کی جنگی زندگی کی ابتدا اس وقت سے ہوگئی تھی جب وہ انیس سال کی عمر میں بنگال آرمی میں بھرتی ہوا تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک سپاہی تھا۔

وہ کان پور، لکھنؤ، دہلی، درۂ خیبر، قندھار اور جنوبی افریقہ میں برطانوی مفاد کی خاطر لڑا اور اس نے کسی بھی

www.taemeernews.com

مورچے پر اپنی شکست تسلیم نہیں کی۔ اس کی ساری عمر جنگ کے میدانوں میں گزری اور اس کی موت بھی میدان جنگ میں ہی ہوئی۔

پہلی جنگ شروع ہونے سے قبل وہ فیلڈ مارشل بن چکا تھا۔ اس کے اعصاب کمزور ہو گئے تھے صحت جواب دے گئی تھی لیکن اس نے ڈاکٹروں کے مشوروں کی کوئی پرواہ نہیں کی اور وہ انگلش چینل عبور کر کے فرانس پہنچ گیا تاکہ برطانوی فوجیوں کو مشورہ دے سکے ---- جب وہ فرانس پہنچا تو برطانوی فوجیں جرمنی افواج کے مقابلہ پر مورچہ بندی کر چکی تھیں ---- ان برطانوی فوجوں میں برطانوی فوجی افسروں کے علاوہ کچھ ہندستانی افسر بھی تھے ان میں ایک ہندستانی افسر پرتاپ سنگھ بھی تھا۔ فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹ اپنے ان ساتھیوں کو دیکھ کر مسکرا دیا ---- اس نے کہا: "میں آگیا ہوں ----" جنگ ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود اس کا بڑا زبردست استقبال کیا گیا ---- لیکن شاید کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ آخری بار مسکرایا ہے ---- چند دن بعد ہی وہ اچانک مرگیا ---- مرتے وقت بھی اس کے کانوں میں توپوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

بحیثیت سپاہی وہ کتنا عظیم تھا اس کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کو دو مرتبہ وکٹوریہ کراس ملا۔ جب اپنی موت سے پندرہ سال قبل اسے اپنے نوجوان بیٹے کی موت کی خبر میدان جنگ سے یہ ملی کہ وہ دشمن سے لڑتا ہوا مارا گیا ہے تو اس نے کہا: "وہ میرا بیٹا تھا ----" اس کے علاوہ اس نے کوئی بات نہیں کہی۔ ملکہ وکٹوریہ نے اس کے لڑکے کو بھی وکٹوریہ کراس دیا تھا۔

بابس کی اصل شہرت کی ابتدا ہندستان سے ہوئی تھی جب وہ غدر ۱۸۵۷ میں ہندستان کے حریت پسندوں سے لڑا تھا۔ وہ کتنا عظیم تھا اس کا اعتراف کرنے کے لئے ایک مرتبہ لارڈ کچنر نے کہا تھا: "میں بابس کے جوتے صاف کرنے میں فخر محسوس کروں گا۔"

غدر ۱۸۵۷ میں وہ لکھنؤ میں تھا اور لکھنؤ میں بڑی زبردست لڑائی جاری تھی۔ اسی زمانے میں کان پور سے خبر آئی کہ وہاں رہنے والے انگریز سخت مصیبت میں ہیں اور کان پور پر حریت پسندوں کا قبضہ ہو گیا ہے۔ سرکالن کیمبل فوراً اپنی فوج کے ساتھ کان پور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس فوج میں بابس بھی شامل تھا اس وقت اس کی عمر صرف ۲۵ سال تھی ---- کان پور میں داخل ہوتے

www.taemeernews.com

ہی باغیوں سے دست بدست جنگ شروع ہوگئی۔ برطانوی پرچم بابس کے ہاتھ میں ہی تھا ——— وہ اپنی فوج سے بچھڑ بھی چکا تھا لیکن اس کے باوجود اس نے ہمت نہیں ہاری اور وہ باغی سپاہیوں سے دست بدست جنگ کرتا رہا اور لڑتا بھڑتا اپنی فوج تک پہنچ گیا۔ اس موقع پر اس نے اتنی بے مثال بہادری دکھائی تھی کہ بعد میں اسے وکٹوریہ کراس کے تمغہ سے نوازا گیا۔ اسی طرح اس نے دہلی میں کشمیری دروازے کے مورچے پر بھی بڑی بہادری دکھائی اور اپنا نام دہلی کے فاتحین کی فہرست میں لکھا لیا۔

غدر ۱۸۵۷ کے خاتمہ کے بعد وہ واپس انگلینڈ چلا گیا اور ایک سال تک وہیں رہا۔ اس کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے اس کو حکم دیا کہ وہ دوبارہ ہندستان جائے۔ اب وہ لیفٹننٹ ہوچکا تھا اور اس وقت اس کی عمر صرف ۲۶ سال تھی۔ جلد ہی اس کو ترقی ملنے لگی، وہ میجر بنایا گیا اور اس کے بعد میجر جنرل۔ اس کی شہرت بھی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی، برطانیہ میں اس کی بہادری اور ہمت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں اسے ایک اور زبردست مہم سونپی گئی۔

افغانستان کی سرحد پر بڑی گڑبڑ تھی۔ حکومت برطانیہ نے اس گڑبڑ کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بابس کو حکم دیا گیا کہ وہ ایک فوج لے کر قندھار کی طرف مارچ کرے۔ ۱۸۷۹ میں اس نے قندھار کی طرف کوچ کیا۔ اسی اثنا میں یہ بھی خبر ملی کہ کابل میں مقیم برطانوی سفیر سر کوگناری کو قتل کر دیا گیا۔ حکومت برطانیہ نے ایک فوج کابل بھی بھیجی اور معاوضہ کا مطالبہ کیا، چناں چہ جنگ ہوئی اور زبردست ہوئی لیکن آخر کار صلح ہوگئی اور افغانستان کے تخت پر ایک نیا امیر بٹھا دیا گیا۔ قندھار میں ایک برطانوی فوج تعینات کر دی گئی۔

لیکن یہ صلح بالکل عارضی ثابت ہوئی۔

بابس کابل سے ہندستان آنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ یہ خبر آئی کہ مشتعل قبائلیوں نے بغاوت کر دی اور قندھار میں مقیم برطانوی فوج کو کاٹ کے رکھ دیا۔ قندھار کا فاصلہ کابل سے تقریباً ساڑھے تین سو میل دور تھا۔ سڑک بھی بہت خراب تھی، جگہ جگہ قبائلی جنگ کے لئے بالکل تیار کھڑے تھے۔ یہ حالات اتنے ناسازگار تھے کہ بابس کے علاوہ کوئی اور ہوتا تو ہمت ہار جاتا لیکن بابس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر حال میں قندھار ضرور پہنچے گا۔

www.taemeernews.com

بالبس نے اپنے افسروں کو بلا کر کہا: "ہم روزانہ بارہ میل چلیں گے، سپاہیوں کے سامان کا وزن کم کر دیا جائے تاکہ ان کو چلنے میں دقت نہ ہو، اور ہم صرف ایک ماہ کا راشن اپنے ساتھ رکھیں گے۔" یہ فیصلے بہت اہم تھے اور بظاہر ناقابلِ عمل تھے کہ ۱۱ اگست ۱۸۸۱ کو اس نے قندھار کی طرف کوچ کر دیا ——— برطانوی فوج کے پاس گاڑیاں بھی کم تھیں، وہ راستہ سے بھی ناواقفیت تھی، جگہ جگہ باغی قبائلی لوٹ مار کرنے اور جنگ کرنے کے لئے تیار کھڑے تھے ——— نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرے ہی دن تمام مقامی گاڑی بان اپنے اپنے مویشی لے کر بھاگ کھڑے ہوئے اور صرف برطانوی سپاہی باقی رہ گئے ——— بالبس کے علاوہ کوئی اور فوجی کمانڈر ہوتا تو اس صورت حال کے آگے سپر انداز ہو جاتا لیکن بالبس نے حوصلے نہیں ہارے اس نے فوج کو حکم دیا: "آگے بڑھتے رہو ——— رفتار میں کوئی کمی نہ آنے پائے ہمیں ہر حال میں قندھار پہنچنا ہے۔"

جب اس پیش قدمی کی خبر دہلی پہنچی تو یہاں کے فوجی افسروں نے کہا: "بالبس خودکشی کر رہا ہے وہ اپنے ساتھ ہزاروں انگریز سپاہیوں کو بھی قتل کرا دینا چاہتا ہے۔"

اور ——— !

کئی ہفتے گزر گئے بالبس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ اب دہلی بھی مایوس ہو گیا اور لندن بھی۔ پورے انگلینڈ میں کہرام مچ گیا لیکن ادھر دور بہت دور پہاڑوں میں ہر مصیبت اور رکاوٹ کا مقابلہ کرتی ہوئی بالبس کی فوج آگے بڑھتی رہی ——— بے شمار سپاہی دن کی گرمی اور رات کی سردی کی تاب نہ لا کر مر گئے۔ جانوروں کے اتلافِ جان کی کوئی انتہا نہ رہی لیکن بالبس کی ثابت قدمی کی وجہ سے اس کے سپاہیوں کے حوصلے بھی بلند رہے بالبس کو اب بھی یہ یقین تھا کہ وہ وقت کے اندر قندھار پہنچ جائے گا ——— اور یہ اس کی انتہائی مستقل مزاجی ہی تھی کہ وہ بجائے ایک مہینے کے صرف بیس دن کے اندر قندھار پہنچ گیا اور اس نے قندھار کو فتح کر لیا۔ افغانی فوج کا سردار ایوب خاں ایک معمولی جنگ کے بعد فرار ہو گیا۔ جب بالبس کی اس فتح کی خبر لندن اور دہلی پہنچی تو دانتوں تلے انگلیاں دبالی گئیں۔ یقیناً بالبس اور اس کے سپاہیوں نے ناممکن کو ممکن کر دیا تھا۔

اب بالبس اپنی ترقی کی انتہائی بلندیوں پر تھا۔ جلد ہی اس کو ہندستان میں کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ اپنے اس عہدے پر وہ سات سال تک رہا۔ اس کے بعد اس کو لارڈ کا خطاب ملا۔ لیکن بالبس کے فوجی ساتھی اسے بالبس کے مختصر نام سے ہی یاد کرتے رہے۔

اکتالیس سال تک وہ ہندستان اور برما میں فوجی خدمات ادا کرتا رہا اور اس کے بعد انگلینڈ واپس آیا جہاں اسے فیلڈ مارشل کا عہدہ دیا گیا اور برطانوی افواج کا کمانڈر انچیف بنا یا گیا۔ اب بالبس کی عمر ستر سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ عام طور سے یہ سمجھا جا رہا تھا کہ وہ اب کوئی اور کام کرنے کے قابل نہیں ہے لیکن یہ ان کی غلط فہمی تھی۔ بالبس کو ابھی اور کئی کام کرنا تھے۔

بالبس ابھی لندن میں آرام کے چند ماہ بھی نہیں گزارنے پایا تھا کہ جنوبی افریقہ میں بوئر جنگ شروع ہو گئی۔ اکتوبر ۱۸۹۹ میں بوئروں نے برطانیہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا اور فوراً ہی برطانوی بستی نٹال پر قبضہ کر لیا۔ برطانوی فوجوں کی تعداد کم تھی اس لئے بوئروں کو ایک کے بعد ایک فتح ہوتی ہی گئی چناں چہ جب یہ خبریں لندن پہنچیں اور لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ انگریز فوجی محاصرہ کی حالت میں گھوڑے کا گوشت کھا رہے ہیں تو ہر طرف سے یہ مطالبہ کیا جانے لگا

www.taemeernews.com

کہ بابس کو جنوبی افریقہ بھیجا جائے۔

بابس نے عوامی مطالبہ مان لیا۔ دوبارہ فوجی وردی پہنی اور جنوبی افریقہ پہنچ گیا۔ یہاں اس نے نئے سرے سے برطانوی فوجوں کو منظم کیا اور جوابی حملے کا آغاز کر دیا۔

بورس بہت بہادر تھے، وہ راستوں سے بھی واقف تھے انہوں نے تین بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا تھا اور وہ پورے جنوبی افریقہ کو ڈچوں کے حوالے کر دینے کا تہیہ کیے ہوئے تھے ان کے پاس وسائل کی بھی کمی نہیں تھی لیکن بابس کو بھی میدان جنگ کا چالیس سالہ تجربہ تھا۔ اس نے ایک ساتھ بوئروں کے تین مورچوں پر بڑے زبردست حملے کیے اور بوئروں کو پہلے ہی دن بدحواس کر دیا۔

ایک ہفتہ کے اندر ہی پانچ ہزار بوئروں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

بابس نے اپنی جنگ جاری رکھی اور صرف پانچ ماہ کے اندر بوئروں کو مکمل شکست دے دی۔ لارڈ کچنر کو جنوبی افریقہ کا انتظام حکومت دینے کے بعد بابس انگلینڈ واپس ہو گیا۔

'بابس' اب بالکل پرسکون زندگی گزارنا چاہتا تھا لیکن شائد اس کی قسمت میں آرام نہیں لکھا تھا ــــ وہ ۸۲ سال کا ہوا تھا کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور وہ فرانس پہنچ گیا۔ جہاں میدان جنگ میں ہی اس کی موت ہو گئی۔

'بابس' ایسے جنگی کمانڈر واقعی کبھی کبھی ہی پیدا ہوتے ہیں۔

www.taemeernews.com

اُس دن غیر ملکی سیاحوں کی بہت بڑی تعداد ایفل ٹاور دیکھنے آئی ہوئی تھی۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی، بچے بھی تھے اور بوڑھے بھی۔ وہ سب خوش تھے، بات بات پر ہنس رہے تھے۔ کئی سیاحوں نے اپنے گلے میں کیمرے لٹکا رکھے تھے اور کئی فوٹو کھینچ رہے تھے۔ ایک نوجوان جوڑا ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لوہے کے جنگلے سے لگا کھڑا تھا۔ ان کی نظریں نیچے بہت نیچے چیونٹی کی طرح رینگتی ہوئی کاروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔

وہ کتنے خوش نظر آ رہے تھے۔ میں جسمانی طور پر ان کے بہت قریب کھڑی تھی لیکن میرا ذہن بہت دور تھا۔

میں ایفل ٹاور تفریح کی غرض سے نہیں آئی تھی۔ بلکہ میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میں یہاں خود کو ہلاک کرنے آئی تھی۔ میری آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں خلا میں اپنی موت کی متلاشی تھیں۔ اُسی لمحے اچانک میرے ذہن میں جین پیئر کی تصویر ابھری۔ اس شخص سے میں محبت کرتی تھی اور اس کا بچہ ان دنوں میرے پیٹ میں پرورش پا رہا تھا۔ میں نے ان خوشگوار لمحات کے بارے میں سوچا جب ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ان غیر ملکی سیاحوں کی طرح پیرس کی سڑکوں پر آوارہ گردی کیا کرتے تھے۔ میں نے اس لمحے کے بارے میں بھی سوچا جب میں تیس برس کی عمر میں پہلی بار کسی کی محبت میں گرفتار ہوئی۔ مجھے وہ دن یاد ہے جب جین نے بڑے پیار بھرے لہجے میں مجھ سے کہا تھا۔

"ہم دونوں برٹینے جائیں گے۔ میں وہاں تمہارے والدین سے بات چیت کروں گا اور آئندہ موسم بہار تک ہم دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے۔"

لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ میں حاملہ ہوں اور میرے پیٹ میں اس کا بچہ پرورش پا رہا ہے تو وہ ایک دم سے بدل گیا۔ میری یہ بات سن کر اس کے چہرے پر کرختگی اور ناگواری کے جو آثار پیدا ہوئے میں انہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ اس وقت اس کی آنکھیں ہر قسم کے جذبات سے عاری تھیں اور اس کا رویہ انتہائی سرد تھا۔

ایفل ٹاور کی ۹۱۰ فٹ کی بلندی پر کھڑے ہو کر میں اپنے ماضی میں جھانک رہی تھی۔ میرے ذہن میں اب بھی یہ الفاظ گونج رہے تھے۔

"جی نہیں جین پیئر گھر پر نہیں ہیں۔ نہیں انہوں نے آپ کے لئے کوئی پیغام نہیں چھوڑا، مجھے نہیں معلوم وہ کب گھر آئیں گے۔"

جین پیئر مجھے چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ وہ مجھ سے اور اپنے ہونے والے بچے سے خوف زدہ تھا۔ مجھے رہ رہ کر اپنی ماں کا خیال آ رہا تھا۔ وہ اس بچے کے بارے میں سنے گی تو مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

پھر جب میں نے اپنے بھائی اینڈرے کی عنقریب ہونے والی شادی کے بارے میں سوچا تو میری آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ میں بھابی بننے والی تھی لیکن ناجائز بچے کو جنم دے کر میں ان کے پاس بدنامی اور رسوائی کے داغ لے کر نہیں جا سکتی۔

کئی ہفتوں تک میں اپنے چھوٹے سے کمرے میں بند رہی۔ میرا دن کا چین اور راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے، میں نے کس طرح جین پیئر سے شادی کی بھیک مانگی تھی۔ میں نے کئی بار اس سے گڑگڑا کر التجا کی تھی کہ وہ مجھ سے شادی کر لے، ورنہ ہمارے بچے کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ میں نے اس سے کہا تھا۔

"جب ہم شادی کر لیں گے تو جو تمہاری مرضی میں آئے کرنا۔ میں تمہارے معاملات میں دخل اندازی نہیں کروں گی۔ تمہارا جی چاہے تو غیر عورتوں کے ساتھ رقص کرنا، ان کے ساتھ

گھومنا پھرنا لیکن خدا کے لئے ایک بار مجھ سے شادی کر لو میں تمہیں
کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گی۔ تمہارا گھر سنبھالوں گی تمہارے
لئے ملازمت کروں گی، تمہارے کپڑے دھوؤں گی"۔

لیکن میری ان باتوں سے اس کا دل نہ پسیج سکا اور وہ
مجھے چھوڑ کر کہیں رُوپوش ہو گیا۔

مایوسی اور نامرادی نے میری ہمت پست کر دی تھی۔
راتوں کو شب بیداری کی حالت میں اپنے پلنگ پر لیٹ کر میں
نے کئی بار ایفل ٹاور کے بارے میں سوچا جہاں سے کود کر تین
سو سے زائد مایوس اور ناامید افراد نے دکھوں اور غموں سے
نجات پائی تھی۔

چناں چہ مارچ ۱۹۶۲ کے ایک خوش گوار دن میں
ایفل ٹاور پہنچی۔ کئی گھنٹوں تک میں یہاں زندگی اور موت کی کشمکش
میں پھنسی رہی۔ پھر اچانک موت کا تصور زندگی کے تصور پر غالب
آگیا۔ میں نے اپنی آنکھوں پر ایک ہاتھ رکھا اور جنگلے پر سے نیچے
کود گئی۔

چند لمحوں تک میں خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتی رہی
پھر ایک زبردست جھٹکے نے میرے جسم کے سارے اعضا کو
جیسے چُور چُور کر کے رکھ دیا۔ میں زمین سے ۰۷ فٹ کی بلندی
پر لوہے کی دو بڑی بڑی سلاخوں کے درمیان الجھ گئی تھی۔
ایک سلاخ میری ران میں پھنسی ہوئی تھی۔ اور میں بے یار و
مددگار خلا میں جھول رہی تھی۔ درد کی شدید لہروں نے مجھے اپنے
شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ میری ران سے بہتے ہوئے خون نے
میرے کپڑوں اور جسم کے باقی حصّے کو سرخ کر دیا تھا۔

میں نے بڑی مایوسی سے نیچے دیکھا جہاں لاتعداد افراد
مجمع کی صورت میں جمع تھے۔ اوپر ایفل ٹاور کی چوٹی بادلوں
میں چھپی ہوئی تھی۔

اس لمحے زندگی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ میرے
سامنے آئی، اچانک میرے ذہن سے مرنے کا خیال محو ہو گیا اور میں
نے زندہ رہنے کی جدّوجہد شروع کر دی۔ مجھے اس بات کا شدید
احساس ہو چلا تھا کہ میرے ساتھ ہونے والے بچّے کی زندگی وابستہ
ہے میں نے خدا سے دعا کی کہ وہ ہم دونوں کو بچا لے۔

میں نے ذرا اوپر ہو کر لوہے کی سلاخ کو پکڑنے کی
کوشش کی تاکہ میرے ران سے اٹھنے والے درد میں کچھ افاقہ
ہو لیکن میری انگلیوں میں طاقت ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے
مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے اپنے گناہوں کی
معافی مانگنے لگی۔

کچھ عرصے بعد جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو سیاہ
ٹوپیاں پہنے کچھ لوگ سیڑھی لگا کر میری طرف بڑھ رہے تھے
میری ران کا گوشت میرے بوجھ سے آہستہ آہستہ پھٹ رہا تھا۔
شدید تکلیف سے میں کراہنے لگی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے
والا تھا کہ اتنے میں مَیں نے اپنے جسم پر انسانی ہاتھوں کا لمس
محسوس کیا۔ اس کے بعد میں بے ہوش ہو گئی۔

میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ دھند میں لپٹی ہوئی
سفید کپڑوں میں ملبوس میرے سامنے چند عورتیں کھڑی تھیں
انھیں دیکھ کر میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں

لیکن ایک آواز نے مجھے چونکا دیا اور میں تصوراتی دنیا
سے نکل آئی میرے سامنے کھڑی ہوئی عورتیں فرشتے نہیں
نرسیں تھیں۔ میں ہسپتال میں تھی اور ڈاکٹروں نے کچھ عرصہ پہلے
میری ٹانگ کا آپریشن کیا تھا انھوں نے مجھ سے کہا۔

"تم نے بڑا احمقانہ قدم اٹھایا تھا۔ انسان کو ہمت سے
کام لینا چاہئے۔ بہر حال تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی"۔

میں اب تک ہسپتال میں مقیم ہوں۔ میری ٹانگ کا زخم
آہستہ آہستہ بھر رہا ہے میں اس معجزے کے لئے خدا کا شکر ادا کرتی
ہوں جس نے میری اور میرے ہونے والے بچّے کی زندگی بچائی۔

www.taemeernews.com

دشمن کی تلاش

یہ سچی داستان افریقہ کے ملک گھانا سے شروع ہوتی ہے۔

گھانا کے صدر نکرومہ کا زوال ہو چکا تھا۔ نئی حکومت قائم ہو چکی تھی اور ملک کے نئے لیڈروں کو پورا یقین تھا کہ ان کے ملک میں غیر ملکی دشمن جاسوسوں کا گروہ موجود ہے۔ کیوں کہ حکومت کے تمام فیصلے خواہ وہ بند کمرے میں ہی کیوں نہ کئے گئے ہوں دشمن ملکوں کو معلوم ہو جاتے ہیں۔

سابق صدر نکرومہ کے تمام قریبی ساتھیوں کو گرفتار کیا جا چکا تھا۔ ان کے کمیونسٹ دوستوں کی نگرانی شروع ہو چکی تھی لیکن پھر بھی کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔

گھانا کی نئی حکومت کو پورا شبہ تھا کہ ان کے ملک میں کمیونسٹ چین جاسوسی کا جال بچھا چکا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ گھانا کے ذریعے پورے افریقہ کو اپنے قابو میں کرے —— معاملہ چونکہ کمیونسٹ چین کا تھا اس لئے گھانا کے نئے عہدے داروں نے امریکہ سے رابطہ قائم کیا اور ایک ہفتہ کے اندر اینڈریو ٹنڈن اپنی سکریٹری کے ساتھ راجدھانی پہنچ گیا۔

اینڈریو امریکہ کی خفیہ پولیس کا ایک تجربہ کار افسر تھا۔ ابھی اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی لیکن اس نے پچھلے دس برس میں اتنے کارنامے انجام دئے تھے کہ

الون لنک

اس کی شہرت کئی ملکوں تک پہنچ چکی تھی یہی حال اس کی سکریٹری روزنا کا بھی تھا۔ وہ صرف خوب صورت نہیں تھی ذہین اور چالاک بھی تھی۔

اینڈریو اور روزنا کی آمد کو بالکل راز میں رکھا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود اینڈریو کی آمد کے چوتھے دن ہی اس پر قاتلانہ حملہ ہو گیا —— یہ اور بات ہے کہ وہ بال بال بچ گیا۔ قاتل کا نشانہ خطا ہو گیا تھا۔ اس حملہ کے بعد اینڈریو کو ہی نہیں تھانا کے افسروں کو بھی یقین ہو گیا کہ امریکی جاسوسوں کی آمد کی خبر غیر ملکی جاسوسوں کو ہو چکی ہے۔

اب اینڈریو نے وہاں رکنا بالکل بے کار سمجھا اور دوسرے ہی دن اس نے روانگی کی تیاریاں مکمل کرلیں۔ انتہائی حفاظت کے ساتھ اسے ہوائی اڈے پہنچایا گیا اور وہ اپنی سکریٹری کے ساتھ لاتعداد افراد کی موجودگی میں ہوائی جہاز پہ سوار ہو گیا۔

لیکن ——

یہ سب اینڈریو کا ڈرامہ تھا۔ اینڈریو وہاں سے گیا ہی نہیں تھا۔ اینڈریو نے اپنے چہرے [illegible] ایک دوسرے آدمی کے چہرے پر لگا دیا تھا اور یہ نقلی اینڈریو ہی جہاز پہ سوار ہوا تھا۔ یہی حال روزنا کا بھی تھا، روزنا کے بجائے بھی ایک نقلی روزنا امریکہ واپس ہوئی تھی۔

www.taemeernews.com

اینڈریو اور روزا دونوں گھانا میں موجود تھے۔

لیکن ـــــ ان دونوں نے میک اپ کر لیا تھا میک اپ اتنا شاندار تھا کہ ان کے قریبی ساتھی بھی ان کی شناخت نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اپنی رہائش گاہ کے لئے ایک پرانا مکان کرایہ پر لے لیا تھا

اینڈریو اب ایک باقاعدہ پروگرام بنا چکا تھا۔ دو ہفتوں تک وہ مقامی لوگوں سے ملتا جلتا رہا اور پھر اس نے ایک مقامی اخبار میں ضرورت ملازمت کے لئے اشتہار بھی دے دیا۔ اس اشتہار میں اس نے اپنے بارے میں یہ بتایا تھا کہ وہ ریڈیو اور وائرلیس کے کام سے بخوبی واقف ہے۔

تین دن تک اسے اس اشتہار کا کوئی جواب نہیں ملا ــــ اس اثناء میں وہ کئی جگہ ملازمت کی تلاش میں گیا اور اس نے ہر جگہ اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کی ایک دل دہلا دینے والی کہانی سنائی۔

چوتھے دن اسے ایک جگہ سے خط مل گیا۔ یہ خط ایک ریڈیو ساز کمپنی نے لکھا تھا۔ کمپنی نے اس کو اپنے کارخانے میں طلب کیا تھا تاکہ اس کا امتحان لیا جا سکے ـــ اینڈریو خط ملتے ہی فیکٹری پہنچ گیا۔

فیکٹری کافی بڑی تھی اور اس میں تقریباً سو کاریگر کام کر رہے تھے۔ اینڈریو کا امتحان لیا گیا اور فیکٹری سپروائزر نے اس کو ملازمت کا اہل قرار دے دیا۔ اب اسے فیکٹری کے مالک کے سامنے پیش کیا گیا۔

فیکٹری کے مالک کا کمرہ بالکل سادہ تھا لیکن اس کی دیواروں پر مختلف افریقی قبیلوں کے چہروں کے آہنی خول بنے لٹکے تھے۔ اینڈریو کو مالک کا یہ ذوق دیکھ کر یقیناً حیرت ہوئی۔ مالک پولینڈ کا رہنے والا تھا اور شاید روسی نسل سے تھا۔ کیونکہ اس کے خدوخال ایک بڑی حد تک روسیوں سے مشابہ تھے مالک نے اینڈریو سے متعدد سوالات کئے اور پھر اس کو ملازم رکھ لیا ـــ چلتے چلتے اینڈریو نے ایک اور درخواست کی "میری بیوی بڑی اچھی ٹائپسٹ ہے۔ اگر آپ اسے بھی کسی جگہ ملازم رکھوا دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی ـــ" اور مالک نے جواب میں کہا "تم کل اس کو لے کر آنا میں سوچوں گا کہ اس کو کہاں کھپایا جا سکتا ہے۔"

اینڈریو فیکٹری سے باہر نکلتے ہی گھانا کے اس افسر سے ملنے روانہ ہو گیا جو خفیہ طور پر اس کی مدد کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا۔ اس افریقی افسر سے اس نے اپنی ملازمت کی پوری داستان سنانے کے بعد کہا "آپ مجھے فیکٹری کے مالک مسٹر تھاپرا کے بارے میں مکمل معلومات آج شام تک فراہم کر دیں ـــ" اس نے اس افسر سے مزید کہا "آپ مجھے بتا چکے ہیں کہ یہاں سے دشمن جاسوس تمام اطلاعات ریڈیو وائرلیس کے ذریعے بھیجتے ہیں اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ایک ریڈیو ساز فیکٹری میں ہی مجھے ملازمت مل گئی ہے۔"

شام تک گھانا کے افسر نے اینڈریو کو مسٹر تھاپرا کے بارے میں ساری معلومات فراہم کر دیں۔ مسٹر تھاپرا گھانا میں تقریباً دس سال سے مقیم تھے، ان کی سابق صدر نکرومہ سے مراسم تھے اور مسٹر نکرومہ نے ان کو گھانا کی شہریت بھی دے دی تھی۔ انہیں یہ فیکٹری بنانے کے لئے حکومت گھانا نے دس لاکھ روپیہ قرض دیا

www.taemeernews.com

تھا۔ مسٹر تھاپرا اکثر غیر ممالک جاتے رہتے ہیں۔ تین برس قبل وہ چین بھی گئے تھے۔ ان کی مالی حالت اچھی ہے وہ شراب اور عورت کے شوقین ہیں ــــ مسٹر تھاپرا کے بارے میں اینڈریو نے پوری سرکاری فائل اسی دن پڑھ لی۔

دوسرے دن وقت مقررہ پر وہ روزا کو لے کر فیکٹری پہنچ گیا۔ اس نے روزا سے کہہ دیا تھا کہ وہ مسٹر تھاپرا کا دل جیتنے کی کوشش کرے ــــ اور اپنے حسن کی بجلیاں گرانے میں کوئی کمی نہ کرے ــــ ذہین روزا نے مسکرا کر کہا "تم اطمینان رکھو ــــ وہ مجھے ضرور ملازم رکھ لے گا اور یہ بھی طے سمجھو کہ میں آج رات کا کھانا اسی کے ساتھ شہر کے کسی ہوٹل میں کھاؤں گی۔"

روزا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مسٹر تھاپرا اس کے حسن سے اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسی وقت اسے اپنا پرائیویٹ سکریٹری مقرر کر لیا۔

کئی دن اسی طرح گزر گئے ــــ

اینڈریو فیکٹری میں کام کرتا اور آنے جانے والوں کی نگرانی کرتا رہا۔ روزا مسٹر تھاپرا کے دفتر میں کام کرتی رہی اور کوشش کرتی رہی کہ اپنے مالک کی زندگی کے ہر گوشے کو دیکھ لے۔ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے اپنے ضمیر کے بالکل برعکس مسٹر تھاپرا کے ساتھ کئی راتیں بھی گزاریں لیکن مسٹر تھاپرا کے انتہائی قریب آنے کے باوجود اس نے ان کو اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ اس کے جسم کو کھلونا بنا لیتے ــــ روزانہ رات کو روزا، اینڈریو کو اپنی رپورٹ دیتی ــــ ایک ہفتہ بعد اس نے اینڈریو سے کہا "میں تھاپرا کے تمام کاغذات کا مطالعہ کر چکی ہوں، میں اس کو شراب کے نشے میں بے ہوش کر کے اس کی تمام الماریوں، بکسوں اور میز کی درازوں کی تلاشی لے چکی ہوں، مجھے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ اس پر دشمن ملک کے جاسوس ہونے کا شک کیا جائے" ــــ دو ہفتے اور گزر گئے اور ایک دن بالکل اچانک اس قصے کا خاتمہ ہو گیا۔

ایک دن تھاپرا نے اینڈریو کو اپنے دفتر طلب کیا۔ روزا بھی موجود تھی اور ایک تیسرا انجانا آدمی بھی۔ اینڈریو جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، تھاپرا نے اپنا پستول نکال لیا اور روزا کو گھسیٹ کر اپنے آگے کر لیا۔ تھاپرا نے کہا "مسٹر اینڈریو ــــ آپ کا کھیل ختم ہو چکا ہے، اب آپ مرنے کے لئے تیار ہو جائیے۔" اتنا کہہ کر تھاپرا نے فائر کر دیا۔ اینڈریو نے اچھل کر نشانہ خالی جانے دیا اور لپک کر دیوار پر لٹکی ہوئی آہنی نقاب اتار لی۔

تھاپرا نے دوسرا فائر کیا ــــ اینڈریو زخمی ہو گیا لیکن اب وہ بھی اپنا پستول نکال چکا تھا۔ پانچ منٹ کے اندر تھاپرا اور اس کے ساتھی زخمی ہو کر گر گئے ــــ اینڈریو نے اسی وقت فون کر کے مقامی پولیس کو طلب کر لیا۔

دشمن جاسوس گرفتار ہو گئے اور وائرلیس بھی مل گئے۔ اصل میں افریقی حبشیوں کے چہروں کے آہنی خولوں کے نیچے ہی وائرلیس لگا ہوا تھا۔ یہ بالکل اتفاق تھا کہ اینڈریو نے ایک آہنی خول گھسیٹ لیا تھا اور اس طرح تھاپرا کی زندگی کا سب سے اہم راز خود فاش ہو گیا تھا۔

www.taemeernews.com

میں موت کی وادی میں گھوم کر آیا ہوں

علی رضا طاہری

تہران کے مرکزی ٹیلی فون ایکس چینج کے آپریٹر نے ابھی ابھی دوپہر کا کھانا کھایا تھا اور ٹانگیں پھیلا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے، سگریٹ سلگانے کی تیاری کر رہا تھا۔ عین اُس وقت سامنے لگا ہوا سُرخ بلب تیزی سے جلنے بجھنے لگا۔ یہ اِس امر کا اشارہ تھا کہ دوسری طرف سے کوئی شخص مرکزی ٹیلی فون ایکس چینج سے رابطہ قائم کر کے کوئی اہم اطلاع پہنچانا چاہتا ہے۔ آپریٹر نے جلدی سے رسیور کان سے لگایا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتا۔ دوسری جانب سے گھبرائی ہوئی آواز سُنائی دی۔

www.taemeernews.com

"ہیلو! ہیلو! یہ کاخک ہے۔ یہ کاخک بات کر رہا ہے۔ زلزلہ، مدد۔ مدد کیجئے، ہم برباد ہو گئے ہیں" اور ان الفاظ کے بعد ٹیلی فونی رابطہ ختم ہو گیا تہران کے آپریٹر نے بار بار کاخک سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس کے اوسان خطا ہو رہے تھے لیکن ابھی تک اُسے یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ ایران کی سرزمین پر پیش آنے والے ہولناک ترین حادثہ کی خبر پانے والا سب سے پہلا انسان ہے۔

ہفتے کا دن تھا ظہر کے بعد جب گھڑی کی سوئیاں ۲ بج کر، ۱ منٹ کا وقت ظاہر کر رہی تھیں تہران کے لوگ حسبِ معمول دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آرام کر رہے تھے اور شمال مشرقی ایران کے علاقے میں موت، خون اور آہ و بکا کی گرم بازاری تھی لیکن تہران میں کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔

اسّی ہزار افراد اس زلزلے کی نذر ہو گئے۔ یہ اتنی بڑی تعداد تھی کہ یقین کرتے ہوئے دل پھٹنے لگتا ہے۔

"ہائے ہائے میرے ابو زیارت کے لئے مشہد گئے ہوئے ہیں۔ خدا کرے وہ زندہ و سلامت ہوں"

"میرے بیوی بچے بھی اُسی طرف گئے ہوئے تھے، اے خدا وہ عذاب سے بچ گئے ہوں"

اس قسم کی باتیں تہران میں قدم قدم پر سُنی جا رہی تھیں، ہر شخص خراسان کے زلزلہ کی ہیبت سے لرز رہا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے بار بار زلزلے کی تفصیلات اور ہلاک ہونے والوں کی صحیح تعداد معلوم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن کسی کو بھی اس بارے میں صحیح علم نہ تھا۔

ملبے نے اِس بچے کے والدین کو نگل لیا ہے

اتوار کی صبح کو میں نے طے کیا کہ پہلے طیارے سے خراسان کے زلزلہ زدہ علاقے کا سفر اختیار کروں، اور زلزلے کی تباہ کاریوں کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھوں میں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ پہلے مجھے تہران سے مشہد پہنچنا تھا اور پھر وہاں سے تربت حیدریہ جانا تھا جو زلزلہ زدہ علاقے میں واقع ہے۔ ڈھائی بجے سہ پہر میرا طیارہ تہران سے روانہ ہوا۔ اور اب پیر کا دن ہے، دن کے ایک بج کر چالیس منٹ ہوئے ہیں میں تہران پہنچ چکا ہوں، اور یقین کیجئے کہ غم نے میرے دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ اپنے آنسو ضبط کرنا میرے لئے ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ جو کچھ وہاں میری بدنصیب آنکھوں نے دیکھا ہے

www.taemeernews.com

زلزلے نے ہزاروں انسانوں کو بے گھر بے در کر دیا

وہ میں آپ کو کس دل سے دکھاؤں۔ بچوں اور مردوں کے وہ بے روح چہرے، زار و قطار روتی اور چیختی ہوئی عورتیں۔ رہ رہ کر ان کے چہرے میری نظروں میں گھوم رہے ہیں اور بار بار میری آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ میں اس قیامت کا تصور اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا۔

ہم تہران سے مشہد پہنچے۔ جگہ جگہ آگ لگنے کی وجہ سے پورا شہر دھوئیں میں لپٹا ہوا تھا۔ ہمیں اتنی فرصت نہیں تھی کہ ہم مشہد کا حال جاننے کے لئے رکتے۔ بس ہمارے انتظار میں تھی اور طیارے سے مشہد کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی ہمیں موت کی وادی کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔

میں سوچ میں ڈوبا بس میں سوار ہونے کے لئے بڑھ رہا تھا۔ اچانک ایک خاتون ہجوم کو چیرتی ہوئی میرے قریب پہنچی اور دونوں ہاتھوں سے میرا کندھا پکڑتے ہوئے بولی۔

"آغا! کیا آپ چرمہ بھی جائیں گے"۔ میں نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ غم نے اس کی چہرے کی رنگت چھین لی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ چلتی پھرتی لاش ہو اور خواب کے عالم میں بول رہی ہو۔

"ہاں خانم! ہم چرمہ بھی جائیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ چرمہ راستے میں پڑنے والے ایک گاؤں کا نام تھا۔

"میرا بڑا لڑکا غلام رضا وہاں ہے۔ وہ وہاں کھیتی باڑی کرتا ہے، خدا کے لئے اُن سے ضرور ملئے اور یہ قرآنِ حکیم اسے پہنچا دیجئے۔ اس کی خیر و برکت سے میرا فرزند سلامت رہے گا اور ہاں اُس سے کہہ دیجئے گا کہ تمہاری ماں تمہارے غم میں موت سے بدتر زندگی گزار رہی ہے۔ خدا کے لئے جلد پہنچو۔"

میں نے قرآنِ حکیم جو ایک تعویذ کی شکل میں تھا اس خاتون سے لے لیا اور اپنے آنسوؤں پر قابو پاتے ہوئے اس کو دلاسہ دیا۔

"مادرِ جان! مطمئن رہیئے، میں غلام رضا سے ضرور ملوں گا۔ آپ کا تحفہ اور پیغام اس کو پہنچانے کے بعد ہی آگے جاؤں گا۔" وہ دیر تک اپنے دل میں رُکے ہوئے لاوے کو اُگلتی رہی اور میں نے بس کے پائیدان پر پاؤں رکھے اس کی ایک ایک بات سنتا اور حسبِ ضرورت جواب دیتا رہا۔ بمشکل تمام اس خاتون نے ہمیں سفر کرنے کی اجازت دی اور بس روانہ ہوئی۔

اس زلزلے میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا مقام گناباد تھا۔ لیکن ہم کچھ دیر کے لئے تربتِ حیدریہ میں بھی ٹھہرے۔ یہ شہر بھی زلزلے کی تباہ کاریوں سے بُری طرح متاثر ہوا ہے۔ وہاں کے ایک باشندے آغائے کمالی نے زلزلے کے چشم دید واقعات اِن الفاظ میں بیان کئے۔

"مجھے کچھ عجیب سی بے کلی محسوس ہو رہی تھی اس لئے میں نے دل بہلانے کے لئے فلم دیکھنے کا پروگرام

www.taemeernews.com

بنایا اور ٹکٹ خرید کر سینما ہال میں داخل ہو گیا۔ ابھی فلم شروع ہونے میں پانچ سات منٹ باقی تھے کہ ایک ہولناک آواز کے ساتھ سینما ہال پر لرزہ طاری ہو گیا۔ سینما میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ اپنی نشستوں سے لڑھک گئے اور اس سے پہلے کہ اصل صورتِ حال معلوم ہو سکے ایک زبردست جھٹکے کے ساتھ سینما کی دیواریں شق ہو گئیں اور چھت ٹوٹ پھوٹ کر نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف جھکنے لگی۔ اچانک ایک شخص نے ہاتھ بلند کر کے دل دوز چیخ ماری "یا امام رضا! زلزلہ آگیا"۔

"یقین کیجیے کہ اس وقت مارے وحشت کے مجھے یہ تک یاد نہ آرہا تھا کہ زلزلہ کا مطلب کیا ہے۔ میں صرف یہ سوچ رہا تھا کہ خواہ مخواہ فلم دیکھنے کا ارادہ کر کے کسی بن بلائی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ چنانچہ دوسروں کی دیکھا دیکھی میں بھی گرتا پڑتا دروازے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ باہر بازار میں قیامت کا منظر تھا۔ عمارتیں ڈھیر ہو رہی تھیں۔ ہر طرف سے چیخ پکار سنائی دے رہی تھی اور اس کے درمیان بار بار اللہ اکبر کی صدائیں گونجتی سنائی دے رہی تھیں۔ اُس وقت نہ صرف میں بلکہ شہر کے بیشتر لوگ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ عذاب کیا ہے اور اس سے نجات کی صورت کیا ہے۔ بوکھلاہٹ میں سب لوگ جدھر مونہہ اُٹھ گیا تھا بھاگے چلے جا رہے تھے۔ زلزلے کے جھٹکے تو جلد ہی ختم ہو گئے تھے لیکن مجھ پر ایسی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ دیر تک میں بغیر سوچے سمجھے بھاگتا چلا گیا۔

تربتِ حیدریہ میں چند لمحے گزارنے کے بعد ہم لوگ زلزلے کے اصل مرکز "کاخت" کی طرف روانہ ہوئے۔ تربتِ حیدریہ سے چند فرلانگ کے فاصلے سے

ہر طرف عورتیں بین کر رہی تھیں

ہی اس ہولناک حادثہ کی تباہ کاریوں کے اصل مناظر ہمیں خون کے آنسو رلانے لگے۔ راستے میں جتنی بستیاں، شہر اور گاؤں آباد تھے اُن کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ ہر جگہ ملبے کے ڈھیر اور جلے ہوئے کھنڈر بکھرے ہوئے تھے جہاں زندگی کی ہماہمی ہوا کرتی تھی، اب وہاں موت کا رقص جاری تھا۔ زلزلے نے بڑی بے رحمی کے ساتھ ہر شہر اور بستی کو اکھاڑ پھینکا تھا۔ شہر "بیدخت" میں میں نے دیکھا کہ ایک شخص ایک نوجوان لڑکی کی لاش کے پاس بیٹھا زار و قطار رو رہا ہے۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ چند لمحے تک تو اُسے میری موجودگی تک کا علم نہ ہوا۔ اس کے بعد جب اس نے مجھے اور میرے فوٹو گرافر کو دیکھا تو اس کے لبوں پر انتہائی حقارت آمیز سا تبسم نمودار ہوا۔

"اوہ تو تم میری پیاری بیٹی کی تصویر کھینچنے کے لئے آئے ہو؟" اس نے کہا۔ مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ کیا جواب دوں؟ مجھے ایک لفظ نہ سوجھ رہا تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور فوٹو گرافر کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

کبھی یہاں آبادی تھی لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں رہا

"آؤ، آؤ! میری محبوب بیٹی کا فوٹو کھینچو۔ دیکھو یہ ہے میری جانِ شیریں جس کے لئے میں زندہ تھا۔ میری راحت، میری جان، دیکھو یہ سُرخ جوڑا دیکھو۔ آج یہ دُلہن بنی ہے۔ دُلہن۔ دیکھ رہے ہونا؟" اور پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، اور پھر لاش پر گر کر اس سے لپٹ گیا اور بار بار اُس کی پیشانی چُومنے لگا۔ میں نے بدقت تمام اُسے الگ کیا اور گفتگو کے لئے آمادہ کیا۔ اُس نے بتایا۔

"یہ میری بیٹی ہے۔ اس کا نام عذرا ہے۔ ہم دونوں باپ بیٹی گھر میں بیٹھے تھے۔ اور اس کے چچازاد بھائی سے اس کی شادی کا مسئلہ زیرِ بحث تھا۔ اچانک عذرا نے رُک کر کہا" بابا! مجھے گھبراہٹ محسوس ہو رہی ہے معلوم نہیں کیا ہونے والا ہے۔ میرا دِل ڈوبتا جا رہا ہے۔" میں نے اسے دِلاسہ دیا۔ لیکن اُسی لمحے زبردست گڑگڑاہٹ سنائی دی اور پھر کسی انجانی قوت نے میرے مکان کو بنیادوں سے اُکھاڑ کر فضا میں اُچھال دیا۔ میں قریب کی کھڑکی میں سے باہر جا گرا اور جب میں نے پلٹ کر اپنے گھر کی طرف دیکھا تو وہ گرد و غبار کے سوا کچھ نہ تھا۔ چیخیں تھیں کہ آسمان تک پہنچ رہی تھیں اور تمام گھر خاک کا ڈھیر بنے ایک دوسرے پر لدے ہوئے تھے۔ شہر کا شہر تباہ ہو گیا اور ہزاروں شہری آن کی آن میں موت کی آغوش میں چلے گئے

گناباد کے ہسپتال میں ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکے کو لایا گیا۔ چھت کا شہتیر گرنے سے اس کی دونوں ٹانگیں بُری طرح کُچلی گئی تھیں اور اس کی جان بچانے کے لئے دونوں ٹانگوں کو کاٹ کر الگ کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس عالم میں اس بچے کو شدید تکلیف محسوس ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن حادثہ کی ہولناکی نے اس کے اعصاب کو بے حس کر دیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا اور ہر شخص سے مخاطب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ اُس نے بتایا کہ دوپہر کو جب گھر کے سب لوگ کھانا کھانے کے لئے بیٹھنے لگے میں کھیل رہا تھا۔ ماں نے مجھے بار بار کھانے کے لئے بلایا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ آخر سب نے کھانا کھا لیا میری چھوٹی بہن گڑیوں سے کھیلنے لگی، باپ سونے کے لئے لیٹ گیا اور ماں سینے پرونے میں مصروف ہو گئی۔ سوا دو بجے کے قریب مجھے بھوک نے ستایا تو میں نے کھانا مانگا۔ ماں اُٹھ کر کھانا نکالنے لگی تو میری نظر کھڑکی کے باہر پڑی۔ سفید دھوئیں کا ایک ہولناک طوفان تیزی کے ساتھ ہمارے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں خوف کے

www.taemeernews.com

ہر شخص رو رہا تھا، ہر طرف قیامت برپا تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی طاقتور دیو نے تمام مکانوں کو اپنے طاقتور ہاتھوں سے مسل دیا ہو

مارے چلانے لگا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میری چیخ و پکار کا کوئی جواب ملتا ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ میرا گھر زمین پر گر پڑا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اپنے باپ اپنی ننھی منی بہن اور ماں کو ملبے کے نیچے روپوش ہوتے دیکھا۔ چھت کا شہتیر میری ٹانگوں پر آن گرا اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔"

یہ بچہ آنے جانے والوں سے بار بار کہتا تھا کہ "خدا کے لئے مجھے بتاؤ، یہ سب خواب تو نہیں؟ میں اب سے پہلے بھی ایسے کئی خواب دیکھ چکا ہوں۔" کاش کہ واقعی یہ ایک خواب ہوتا۔

میں نے اپنی پوری زندگی میں اس قدر ہولناک منظر کا کبھی تصور تک نہ کیا تھا۔ میں اس قیامت کی زد میں آنے والے علاقے میں جہاں جہاں گیا میں نے ایسے دردناک اور رقت انگیز مناظر دیکھے کہ ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میری آنکھوں سے زار و قطار آنسو برس رہے تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ ہنستی بستی آبادیوں میں امن و سکون کے گہوارے، گھر اپنے مکینوں کے لئے قیمہ کوٹنے کی مشین بن گئے تھے۔ لاشیں جو ملبے سے نکالی جا رہی تھیں۔ ایسی ابتر حالت میں تھیں اور زلزلے کی قیامت خیزی کی ایسی لرزہ خیز داستان سنا رہی تھیں کہ اسے دہرانے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

یہ زلزلہ "کاخت" سے شروع ہوا اور پھر چاروں طرف پھیلتا چلا گیا۔ کاخت سے تھوڑے فاصلے پر ٹیلی فون ایکس چینج میں ٹیلی فون آپریٹر ریسیور گود میں رکھے اپنی کرسی پر بے حس پڑا ہوا تھا۔ عمارت کے آہنی شہتیر نے گر کر اسے وہیں بیٹھے بیٹھے ختم کر دیا تھا۔ اس آپریٹر کا تعلق شہر کے ایکس چینج سے تھا۔ جب شہر زلزلے کے پہلے جھٹکے ہی میں تباہ ہو گیا اور پھر ٹیلی فون کا رابطہ ختم ہو گیا تو اس فرض شناس نوجوان نے تقریباً پانچ میل کا فاصلہ اس ہولناک فضا میں پیدل طے کیا اور شہر کے باہر واقع ایکس چینج پر پہنچا۔ وہاں کے تمام آپریٹر زلزلے سے خوف زدہ ہو کر بھاگ چکے تھے۔ اس نے سیٹ اٹھا کر تہران کو نامکمل خبر پہنچائی اور پھر آہنی شہتیر کے نیچے دب کر ہلاک ہو گیا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں میں نے ایک چیز واضح طور پر دیکھی۔ وہ تھی اُمید —— زندگی اور نجات کی اُمید۔

www.taemeernews.com

کا نمک میں زندگی کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ زلے نے اس شہر کو بنیاد سے اکھاڑ کر کچھ اس طرح پھینکا کہ نہ مکان سلامت رہے نہ مکین۔ اس شہر کی آبادی ۱۴ ہزار نفوس پر مشتمل تھی جن میں سے ایک بھی باقی نہیں بچا۔ مکانات کا یہ حشر ہوا ہے کہ پورے علاقے میں کوئی کمرہ یا چھت تو کجا، کوئی دیوار تک سلامت نہیں رہی۔

مجھے وہاں ایک عورت ملی جو اس زور سے اپنے سر کے بال نوچ رہی تھی کہ اس کے سر سے خون رس رس کر اس کے ہاتھوں تک پہنچ گیا تھا۔ وہ بار بار اپنے بالوں کو جھٹکے دیتی تھی اور چیخ چیخ کر کہتی تھی۔

"خدایا! آخر یہ کس جرم کی سزا ہے۔ ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

میں نے اسے دلاسہ دینے کی کوشش کی "خانم جان! صبر کیجئے، صبر کیجئے۔ دیکھئے آپ کی طرح دوسرے ہزاروں لوگوں کے عزیز بھی ہلاک ہو گئے ہیں۔ یہ غم صرف آپ کا نہیں، ہزاروں دوسرے لوگوں کا بھی ہے۔"

اس نے وحشت ناک نگاہوں سے مجھے دیکھا اور پھر بولی "ہاں دوسرے لوگوں کے عزیز بھی ہلاک ہو گئے ہیں، لیکن مجھ سا بدنصیب ان میں ایک بھی نہیں ہے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پھر بولی "چھ سال پہلے ہم بوئین زہرا میں رہتے تھے۔ وہاں ہولناک زلزلہ آیا۔ میرا پیرا اس میں ضائع ہوگیا۔ میرے ماں باپ، دو بھائی اور تین بہنیں ہلاک ہوگئیں۔ میرے شوہر کا پورا خاندان بھی ہلاک ہوگیا۔ اس کے بعد ہم تباہ و برباد حالت میں گناباد آکر آباد ہو گئے۔ لیکن موت نے یہاں بھی ہمارا پیچھا نہ چھوڑا۔ کل میرا شوہر نصر اللہ اور میرا بیٹا محرم ایک عزیز سے ملنے کاخک آئے تھے اور زلزلے کی نذر ہو گئے۔ اب میرے لئے باقی کیا بچا ہے۔ اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی اور اسے دلاسہ دینے کے بجائے میں بھی زار و قطار رونے لگا۔

ایک عمر رسیدہ خاتون کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا تہران گیا ہوا تھا اور اپنے ننھے منے بیٹے کو دادی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ زلزلے نے گھر کو تہ و بالا کر دیا اور معصوم بچہ ملبے میں دب کر ہلاک ہوگیا۔ ضعیف خاتون نے ہاتھوں سے ملبہ کرید کرید کر نہ جانے کتنے گھنٹے کی مشقت کے بعد پوتے کی لاش برآمد کی لیکن لاش ایک بھاری پتھر کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ اس پر دیوانگی طاری ہوگئی۔ اس نے بچے کا ہاتھ پکڑا اور پوری طاقت سے کھینچنا شروع کر دیا۔ بالآخر معصوم بچے کا ہاتھ کندھے سے جدا ہوگیا۔ ضعیفہ نے معصوم پوتے کے خون آلود ہاتھ کو بوسہ دیا اور سر پر خاک ڈال کر جنگل کی طرف روانہ ہوگئی۔ بعد میں اس کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔

شہر جوئی مند کی ۹۰ فی صد عورتیں اور مرد زلزلے کا شکار ہو گئے لیکن ۹۹ فی صد بچے اس ہلاکت خیزی سے معجزانہ طور پر بچ گئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ زلزلے کے وقت تمام بچے گھروں سے باہر میدان میں کھیل رہے تھے اور ان کے بزرگ گھروں میں آرام کر رہے تھے۔ اب تک ملبے میں سے صرف ایک بچے کی لاش ملی ہے۔ اس کی عمر صرف دس گھنٹے تھی اور وہ ماں کے پہلو میں پڑا دودھ پی رہا تھا کہ زلزلے نے ماں اور بیٹے کو موت کا پیغام سنا دیا۔

"میں نے موت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے" دشت سفید کے ایک باشندے نے کانپتے ہوئے بتایا۔

www.taemeernews.com

دوپہر کا وقت تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور ہوا بھی تیزی سے چل رہی تھی۔ میں دفتر میں اپنے فرائض انجام دے کر گھر واپس آرہا تھا اپنی گلی میں داخل ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک بھاری بھرکم کتا بار بار زمین کی طرف مونہہ کرکے چیختا ہے اور اپنے پورے بدن کو اکڑا کر فضا میں اچھل رہا ہے۔ میں سمجھا کہ کتا باؤلہ ہوگیا ہے اس لئے اس سے ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا اور دوسری گلیوں میں سے چکر کاٹ کر اپنے گھر کی طرف جانے لگا۔ کاش کہ میں اس وقت سمجھ سکتا کہ کتا باؤلہ نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے آنے والے زلزلے کی اطلاع دے رہا تھا۔

میں ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ زمین بری طرح لرزنے لگی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے گرد و پیش کی ہر چیز فضا میں چکر لگانے لگی ہے میں سمجھا کہ مجھے چکر آگیا ہے۔ میں نے بچنے کے لئے ایک دیوار پر ہاتھ رکھ دیا، لیکن میں اور دیوار ایک ساتھ زمین پر آن رہے۔ ایک بھاری پتھر میرے سر کے قریب گرا اور میرے سر کو لہولہان کرتا ہوا لڑھک کر دور جا گرا۔ یہ زلزلہ اس قدر تیزی کے ساتھ آیا تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں تو کیا کوئی بھی اس کی کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا۔ گرے ہوئے مکان کے ملبے پر بے حس و حرکت پڑا میں شہر کو پیوندِ خاک ہوتے دیکھ رہا تھا۔ مکان اچانک بنیادوں سمیت زمین سے بلند ہوتے تھے اور پھر خاک کا ڈھیر بن جاتے تھے۔ ہر طرف خون کا دریا رواں تھا اور مرنے والوں کی چیخ و پکار سے فضا میں قیامت سی برپا تھی۔ مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اپنی جگہ سے ہل بھی سکوں، بلکہ میں تو کوشش کے باوجود اپنی آنکھیں تک بند نہ کر سکا کہ اس ہولناک منظر کو دیکھنے سے باز رہ سکوں

بیاض کے جنگل میں لگائے جانے والے ایرانی ریڈ کراس کے امدادی مرکز میں لائی جانے والی ایک نوعمر زخمی خاتون نے مجھے بتایا:

"جس وقت زلزلہ آیا مجھے یہی محسوس ہوا کہ کوئی غیر مرئی طاقت میرے بدن پر چھڑیاں برسا رہی ہے"

اس خاتون نے مزید بتایا "میں اس وقت اپنے کمرے میں بیٹھی علی کا انتظار کر رہی تھی۔ علی تھوڑی دیر بعد اپنے عزیزوں کے ہمراہ مجھے منگنی کی انگوٹھی پہنانے آنے والا تھا۔ لیکن اس سے پہلے زلزلہ آگیا اور سب ختم ہوگیا۔ جناب! محمد پر ایک احسان کیجئے۔ علی کو پیغام بھجوا دیجئے کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ اور اب بھی صرف اور صرف اسی کی ہوں۔ وہ آکر مجھے لے جائے۔ میں اپنے عہد پر قائم ہوں۔" اس بے چاری کو یہ کون بتاتا کہ اس کا علی اپنی محبت کو سینے میں چھپائے اس دنیا سے جا چکا ہے اور اس کے پیغامِ محبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے نیاز ہو چکا ہے۔

اس زلزلے سے ایران کے یہ تاریخی شہر اور قصبات متاثر ہوئے۔ سراوان، طبس، بیرجند، تربت جام، تربت حیدریہ، نیشاپور، بشرویہ، سرخس، مشہد، فردوس گناباد، قائن، خواف، بیدخت، بجستان، فیض آباد، کاشمر اور دشتِ بیاض۔ ان میں سے چند کو چھوڑ کر باقی تمام شہر صفحۂ ہستی سے مکمل طور پر مٹ گئے۔ ان میں وہ درجنوں چھوٹے چھوٹے گاؤں شامل نہیں ہیں جو شہری آبادیوں کے اطراف واقع تھے۔ تباہ ہونے والی آبادیوں کی مجموعی تعداد ۱۵۰ کے قریب ہے۔

www.taemeernews.com

میری کوب

ہیروں کا چور کیسے پکڑا گیا

پچاس لاکھ روپے کے ہیرے چوری ہو چکے تھے ـــــ

یہ ہیرے برطانیہ کے ایک بینک کے لاکر سے چوری ہوئے تھے۔ ہیروں کا مالک ایک غیر ملکی بادشاہ تھا۔ اس نے حفاظت کے خیال سے یہ ہیرے برطانیہ کے اس بینک میں امانتاً رکھوائے تھے، بینک ڈائرکٹر کو چونکہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا اس لئے وہ بھی ہر ہفتہ اس لاکر کو چیک کر لیا کرتا تھا۔

بینک ڈائرکٹر ہفتہ کی شام کو بینک بند ہونے سے قبل یہ ہیرے دیکھ لیا تھا، لیکن ۲۴ جنوری کی

www.taemeernews.com

شام کو جب اُس نے لاکر کھولا تو یہ دیکھ کر اس کے حلق سے ایک گھُٹی گھُٹی سی چیخ نکل گئی کہ لاکر بالکل خالی پڑا ہے ــــ اُس نے اُسی وقت پولیس کو اس چوری کی اطلاع دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی درخواست کی کہ چونکہ بنک کی بدنامی ہوگی اس لئے چوری کا پروپیگنڈا نہ کیا جائے۔

بنک ڈائرکٹر نے ہیروں کے مالک کو بھی اس چوری کی اطلاع فوری طور پر نہیں کی ــــ اطلاع ملنے کے پندرہ منٹ کے اندر ہی اسکاٹ لینڈ یارڈ کے دو افسر بنک پہنچ گئے۔ لاکر کے ابتدائی معائنے کے بعد انہوں نے چوری کے بارے میں چار رائیں ظاہر کیں۔

۱۔ چور بنک کا ڈائرکٹر بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ یہ چور خود ہیروں کا مالک بھی ہو سکتا ہے تاکہ ہیرے نکالنے کے بعد بنک سے معاوضہ طلب کرے۔

۳۔ ہیروں کا چور کوئی باہر کا آدمی بھی ہو سکتا ہے۔

۴۔ بنک کے عملہ کا کوئی آدمی بھی جو لاکر میں پچاس لاکھ کے ہیروں کی موجودگی کے راز سے واقف ہو یہ چوری کر سکتا ہے۔

www.taemeernews.com

ان افسروں نے سب سے پہلے ڈائرکٹر پر اپنا شبہ ظاہر کیا۔ ڈائرکٹر نے کہا "مجھ پر شبہ کر کے آپ غلط راستے پر گامزن ہو جائیں گے اور اس طرح آپ کبھی بھی چور کو گرفتار نہ کر سکیں گے۔ یہ ہیرے گذشتہ دس سال سے ہمارے بینک کے لاکر میں رکھے تھے، اس لئے اگر میں چاہتا اور میری نیت خراب ہو گئی ہوتی تو میں بہت پہلے ہی ان ہیروں کی چوری کر چکا ہوتا۔"

اپنی صفائی دینے کے بعد اس نے کہا "بینک کا کوئی عملہ بھی چوری نہیں کر سکتا، کیوں کہ میرے علاوہ کوئی بھی ان ہیروں کی موجودگی سے واقف نہیں تھا ——"

اسکاٹ لینڈ یارڈ کے افسروں کے مزید سوالوں کے جواب میں بینک ڈائرکٹر نے کہا "لاکر چابیاں میری ذاتی تجوری میں رکھی رہتی تھیں اور تجوری میرے علاوہ کوئی دوسرا آدمی کھول ہی نہیں سکتا تھا۔"

اب سوال یہ تھا کہ پھر ہیرے چوری کیوں کر ہوئے؟

بینک ڈائرکٹر کا اصرار تھا کہ ہیروں کے مالک کو جو ایک ملک کا بادشاہ ہے ہیروں کی چوری سے مطلع نہ کیا جائے لیکن پولیس افسروں نے اس اصرار کے باوجود اس بادشاہ سے ملنے کا فیصلہ کر لیا، البتہ یہ وعدہ بھی کر لیا کہ بادشاہ کو اس چوری سے مطلع نہیں کیا جائے گا —— بہرحال یہ شبہ اپنی جگہ باقی تھا کہ چوری اس بادشاہ کے اشارے پر بھی ہو سکتی ہے کیوں کہ لاکر کی ایک چابی اس کے پاس بھی تھی۔

ایک ہفتہ کے اندر ہی یہ دونوں افسر اس بادشاہ سے ملنے اس کے ملک پہنچ گئے۔ انہوں نے خود کو ہیروں کا تاجر بتایا اور کہا کہ وہ کچھ ہیرے فروخت کرنا چاہتے ہیں، لیکن بادشاہ نے ہیرے خریدنے سے انکار کر دیا اور کہا "میرے پاس بہت زیادہ ہیرے موجود ہیں اور میں خود ان کو فروخت کرنا چاہتا ہوں۔"

"چلئے یوں ہی سہی ——" ایک برطانوی افسر نے کہا "آپ ہمیں اپنے جواہرات دکھا دیجئے۔ شاید ہمارا آپ سے کچھ سودا ہو جائے۔"

"لیکن ہیرے اِس وقت میرے پاس موجود نہیں ہیں۔" بادشاہ نے جواب دیا۔

"پھر آپ ہمیں کس دن وہ ہیرے دکھا سکیں گے" افسر نے پوچھا۔

"فی الحال دو ماہ تک میں آپ کو اپنے ہیرے نہ دکھا سکوں گا، کیوں کہ یہ ہیرے لندن کے ایک بینک میں محفوظ ہیں۔ میں دو ماہ بعد لندن جاؤں گا اور آپ کو اپنی آمد کی تاریخ سے مطلع کر دوں گا۔"

برطانوی افسروں نے اس کے بعد بادشاہ سے اور کوئی گفتگو نہیں کی —— لیکن انہوں نے محل سے باہر نکلنے کے بعد بھی اپنی تفتیش جاری رکھی۔

اس تفتیش کے دَوران انہیں یہ معلوم ہوا کہ بادشاہ ابھی دو ماہ قبل بھی ایک ہفتہ کے لئے لندن گیا تھا اور امپیریل ہوٹل میں ٹھہرا تھا —— اب وہ لندن واپس ہوئے۔ انہوں نے ہوٹل منیجر سے ملاقات کی۔ ہوٹل منیجر نے انہیں بتایا "بادشاہ ہوٹل میں بالکل تنہا ٹھہرا تھا۔ اس سے ایک عورت اور ایک مرد روزانہ ملنے آیا کرتے تھے۔ مَرد کا نام جیمس مارٹن ہے اور وہ ایک شبینہ کلب کا مالک ہے، عورت اسی کلب میں رقاصہ کی حیثیت سے ملازم ہے۔" ہوٹل منیجر نے اپنا شبہ ظاہر کیا کہ اس عورت سے بادشاہ کے کچھ خفیہ تعلقات ضرور ہیں کیوں کہ وہ اکثر راتے گئے تک بادشاہ کے ساتھ تنہا رہا کرتی تھی اور

www.taemeernews.com

دونوں سے نوشی کیا کرتے تھے۔"

اسکاٹ لینڈ کے افسروں نے اس کے بعد دوبارہ بینک منیجر سے ملاقات کی اور کہا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے چوری شدہ ہیروں کا مالک دو ماہ قبل لندن آیا تھا۔"

"جی نہیں ——" بینک منیجر نے جواب دیا۔ "انہوں نے مجھے اپنی آمد سے مطلع نہیں کیا تھا۔"

اب ان دونوں افسروں نے جیمس مارٹن کے بارے میں تفتیش کی اور کلب کی رقاصہ کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ جیمس مارٹن کے بارے میں انہیں معلوم ہوا کہ وہ دو دفعہ کا سزا یافتہ ہے۔ ایک مرتبہ غبن کے الزام میں اور دوسری مرتبہ ایک عورت کو سڑک پر چھیڑنے کے جرم میں —— یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا کلب عیاشی کا بڑا بدنام اڈہ ہے۔

دونوں افسروں نے گاہک کی حیثیت سے اس کلب کا بھی معائنہ کیا۔ کلب واقعی عیاشی کا اڈہ تھا۔ اس وقت رقاصہ بھی موجود تھی جو تقریباً نیم عریاں لباس میں رقص کر رہی تھی۔ افسروں کو معلوم ہوا کہ یہ رقاصہ بھی ایک پیشہ ور عورت ہے۔

دونوں افسر اب اس نظریے سے تحقیق کر رہے تھے کہ بہت ممکن ہے بادشاہ نے خود ہی یہ ہیرے چوری کروا لئے ہوں۔ ایک ہفتہ کے اندر انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جیمس مارٹن نے ابھی چند دن قبل بادشاہ سے ٹرنک کال کر کے بات کی تھی، لیکن دونوں کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی اس کا علم ان دونوں کو نہ ہو سکا۔

آخر انہوں نے جیمس مارٹن سے براہ راست گفتگو کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

دوسرے دن وہ اس کے کلب گئے اور انہوں نے جیمس مارٹن سے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا "ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ نے ۱۱ جنوری کو بادشاہ . . . . سے ٹرنک کال پر کیا گفتگو کی تھی۔"

"لیکن آپ یہ سوال کیوں کر رہے ہیں۔" مارٹن نے ذرا گھبرا کر جواب دیا۔

"یہ ایک سرکاری راز ہے اور چونکہ معاملہ ایک غیر ملکی بادشاہ کی ذات سے متعلق ہے اس لئے میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتا لیکن اگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تو میں تمہیں ابھی اور اسی جگہ گرفتار کر لوں گا۔"

ایک منٹ تک مارٹن خاموش رہا اور پھر اس نے کہا "میں نے ہز ہائی نس سے مس ماریا کے بارے میں جو میرے کلب میں رقص کرتی ہے کچھ بات کی تھی۔"

"کیا بات کی تھی ؟" ایک افسر نے پوچھا

"وہ دراصل چند دنوں کے لئے ہز ہائی نس کے ملک جانا چاہتی ہے۔" مارٹن نے رُک رُک کر کہا۔ لیکن اسکاٹ لینڈ کے افسر نے اب براہ راست سوال کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔ اس نے کہا "تم صاف صاف بتاؤ کہ تم نے ہیروں کے متعلق کیا بات کی تھی ——" اس جملے کا افسر کے منہ سے نکلنا تھا کہ سارا تماشہ ختم ہو گیا۔ مارٹن نے جواب دینے کے بجائے پستول نکال لیا۔ افسر نے اپنے بچاؤ کے لئے ایک مجسمہ کا جو اسی جگہ رکھا تھا سہارا لیا۔ فائر ہوا اور فائر کے ساتھ ہی بت گر پڑا —— اور بینک سے چوری شدہ ہیرے فرش پر بکھر گئے —— یہ ہیرے اسی بت میں رکھے تھے۔

ایک معمولی سے سانحہ نے پورا کیس ختم کرا دیا۔

www.taemeernews.com

مسجد عمرؓ کو بچاؤ!

محمد اسلام

قاہرہ میں عرب لیگ کے مرکزی دفتر کو اس کے عمان کے نامہ نگار مسٹر عبدالحفیظ محمود نے اُس خط کا ترجمہ بھیجا ہے جس کو امریکہ کی ایک ماسونی تنظیم کے صدر گریڈیی، ایس، ٹروی نے بیت المقدس میں مسجد عمرؓ کی انتظامیہ کمیٹی کو بتاریخ ۳۰ رمئی ۱۹۶۸ بھیجا تھا۔

اس خط میں انھوں نے یہ لکھا تھا کہ عنقریب ہی وہ بیت المقدس پہنچنے والے ہیں اور انھیں یہ امید ہے کہ اس وقت تک مسجد عمرؓ کی جگہ ہیکلِ سلیمان کی تعمیر مکمل ہو چکی ہوگی۔ اس خط میں انہوں نے مجلس انتظامیہ کے سامنے ہیکلِ سلیمانی کی تعمیر کے خرچ پر ساڑھے دس کروڑ ڈالر جمع کرنے سے متعلق ایک مفصل پروگرام رکھا ہے۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس منصوبے سے صرف یہی نہیں کہ بیت المقدس کی قدیم اسلامی تاریخ کو زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے بلکہ اس سے دنیا بھر کے

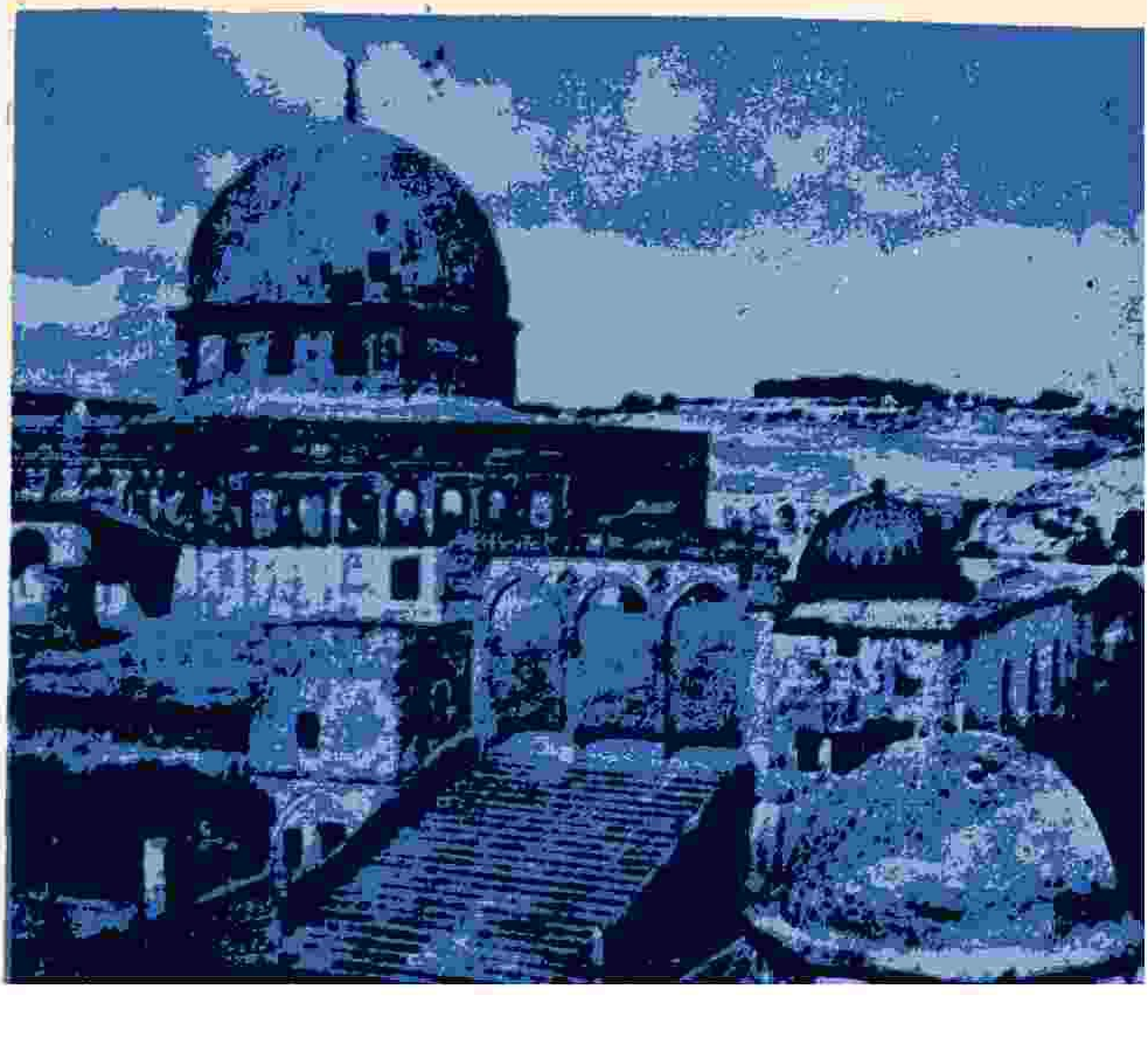

www.taemeernews.com

مسجد عمر کا ایک رُوح پرور منظر

مسجد کے قریب کے دیگر مقدس مقامات

مسلمانوں کے قابلِ احترام مقامات کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا ہے۔

ایسی خبریں مسلسل مل رہی ہیں کہ مسجد عمر کی دیواروں کے ساتھ ساتھ ہیکل سلیمانی کی بنیاد کھودی جا رہی ہے اور اب تک تقریباً دس میٹر گہری کھدائی ہو چکی ہے۔ یہودیوں کی اس شرمناک حرکت سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ وہ مسجد عمرؓ اور مسلمانوں کے تمام مقدس مقامات کو ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ چشم دید لوگوں کا بیان ہے کہ دو سو مزدور مختلف قسم کی مشینوں سے مسجد عمرؓ کی داہنی اور بائیں دیواروں کے ساتھ ساتھ کھدائی کرنے میں مصروف ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ مسجد اقصیٰ اور اسلامی میوزیم سے تقریباً ۲۵ میٹر کے فاصلے سے ایک عمارت کی تعمیر ہو رہی ہے۔ جس کی دیواریں اس وقت ۱۵ میٹر اونچی پہنچ چکی ہیں اور مسجد عمرؓ کے مغربی حصے سے ایک سرنگ کھودی گئی ہے جو اسلامی میوزیم کی دیواروں کے نیچے سے ہوتی ہوئی گزرتی ہے جس کی وجہ سے اسلامی میوزیم کی دیواریں پھٹ گئی ہیں۔

انوار بیروت ۳۰ جولائی ۱۹۶۸ قاہرہ میں عرب لیگ کا مرکزی دفتر اسلامی مقدس مقامات پر اس منڈلاتے ہوئے عظیم خطرے کے پیش نظر اس بات کی سخت اور فوری ضرورت محسوس کر رہا ہے کہ منظم نشر و اشاعت کے ذریعے سے پوری دنیا خاص طور پر اسلامی ممالک کی رائے عامہ سے یہ اپیل کی جائے کہ وہ اسرائیل کو اس قدر خطرناک اور شرمناک اقدام سے باز رکھے۔

اس خط کا لفظی ترجمہ یہ ہے ۔

۳۰ رمئی ۱۹۷۰ء

اراکین مجلس انتظامیہ مسجد عمر
بیت المقدس ۔ اسرائیل

معزز اراکین! میں امریکی باشندہ ہوں میرے آباؤ اجداد آئرلینڈ اور اُردن سے تعلق رکھتے تھے۔ میری دادی اُردن کی راجدھانی عمان میں پیدا ہوئی تھیں۔ مجھے اپنے مسیحی المذہب اور عربی النسل ہونے پر فخر ہے میں اگلے مہینے یعنی جون کی ۲۰ تاریخ کو تل ابیب پہنچ رہا ہوں، اور وہاں سے فوراً ہی بیت المقدس کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔ مجھے اس بات کی پوری اُمید ہے کہ میں آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرسکوں گا۔

کچھ دنوں پہلے میں نے مسجد عمر کے پتے سے ایک خط بھیجا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خط مطلوبہ اشخاص کو نہیں مل سکا۔

میرا یہ سفر بہت ہی مختصر ہوگا۔ میرے ہم رکاب میرے رفیق اودی معادی ہوں گے۔ ہم دونوں ہی ماسونی مجلس کے رکن ہیں۔ یہ مجلس قدیم آزاد اور معزز ماسونیوں کی صحیح روایات کی علم بردار ہے۔ یقیناً آپ حضرات اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہیکل سلیمانی ہی ماسونی مجلس کا اصلی مقام تھا جس کے صدر شاہ سلیمان تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ ہیکل ۷۰ء میں تباہ کر دیا گیا، مجھے معلوم ہے کہ آپ کی مسجد اس ہیکل کی جائز اور صحیح نمائندہ ہے کیوں کہ یہ مسجد اس متبرک مقام پر واقع ہے جہاں "صخرہ" ہے اور جہاں پر کہ ہمارے جدِ امجد حضرت ابراہیم نے اپنے بیٹے اسحاق کو بارگاہِ ایزدی میں قربانی کے لئے پیش کیا تھا، مجھے اس بات کا بھی پورے طور پر احساس ہے کہ وہ ہمارے عرب بھائی (بنی اسماعیل) ہی تھے جنہوں نے صدہا سال "صخرہ" کی حفاظت و نگرانی کا کام انجام دیا اس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

مسیحی ہونے اور ماسونی تنظیم کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے میں امریکہ میں ایک ماسونی انجمن کا صدر رہوں۔ جس کی زبردست خواہش ہے کہ ہیکل سلیمانی کی ازسرِ نو تعمیر ہو۔ اس سلسلہ میں ہم آپ کے سامنے مندرجہ ذیل تجویز پیش کرتے ہیں۔ اگر آپ اس تجویز کو منظور کرتے ہوئے ہمارے منصوبہ کو روبہ عمل لانے کے لئے یقین دلائیں تو ہم تخمینہ سترہ دس کروڑ ڈالر یا اس کی تعمیر پر جو بھی لاگت آئے اس کا بندوبست کرنے کے لئے تیار ہیں۔ عمارت کی تمام تر ذمہ داری ہم پر ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود اس ہیکل کے انتظام و انصرام کا دروبست اختیار آپ ہی کی مسجد کی مجلس انتظامیہ کے ہاتھوں میں ہوگا، اور اس کی تعمیر مکمل ہو جانے کے بعد اسے اللہ، شاہ سلیمان اور عالمی ماسونی تنظیم کے نام پر نذر کر دیا جائے گا۔ اس طرح ہیکل سلیمانی کی عمارت ازسرِ نو اپنا اصلی روپ دھار لینے کے بعد بالکل مفت آپ کو مل جائے گی۔ آپ کی مجلس انتظامیہ کی منظوری کے بعد جو خواہش مند ماسونی بھائی اس ہیکل سلیمانی کی تعمیر میں حصہ لے گا اسے بیت المقدس میں محفل شاہ سلیمان ماسونی نمبر ایک کی ممبر شپ کا اعزاز دیا جائے گا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں رہنے والا ماسونی محفل شاہ سلیمان ماسونی کی ممبر شپ کا خواہش مند ہوگا۔

اور مزید براں یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ اراکین زندگی بھر ہیکل کی زیارت کا شرف حاصل نہ کرسکیں، ان اراکین کے

www.taemeernews.com

انتقال کے بعد ان کی ممبرشپ ماسونی نظام سے وابستہ ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اور ہر سال اس کی ازسرنو تجدید کی جاتی رہے گی، اس طرح سے ہیکل کو کروڑوں روپے سالانہ ملتے رہیں گے جو اس کے انتظام اور مسجد عمر کے خاص مقاصد کے لئے بہت کافی ہوں گے بالفاظ دیگر کبھی آپ کو اپنے ممبروں سے کسی بھی قسم کی امداد وغیرہ لینے کی ضرورت نہیں پیش آئے گی اور دنیا میں اگر چہ میرے علم کی حد تک ایسا کوئی مذہبی عظیم ادارہ نہیں ہے جو اپنے اراکین کی امداد کے بغیر اپنا کام بحسن و خوبی چلا رہا ہو۔ لیکن میں آپ حضرات کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے ہیکل کی تعمیر میں ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کیا تو آپ کی مسجد کا انتظامی ادارہ روئے زمین پر سب سے زیادہ مال دار مذہبی ادارہ ہوگا۔

لہٰذا اگر آپ حضرات اس بات پر راضی ہوں کہ آپ کے ادنیٰ نقصان کے بغیر آپ کو اخراجات کی پوری رقم مل جائے تو ہم ہیکل کی تعمیر کے لئے روپیہ روانہ کرنے پر آمادہ ہیں، تعمیر کا کام مکمل طور پر آپ ہی حضرات کے ہاتھوں انجام پائے گا۔ آپ اپنی حسب مرضی جس کو چاہیں اس کا ٹھیکہ دے سکیں گے۔ ہماری شرط صرف یہ ہے کہ آپ محض ہیکل کا ایک خاص حصہ "ماسونی مقاصد" کیلئے ماسونی تنظیم کو دے دیں باقی عمارت کو آپ اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکیں گے۔ کیونکہ ہیکل دراصل آپ ہی کی ملکیت ہوگا۔ ہمارا مقصد اس کو ازسرنو تعمیر کرا دینا ہے ۔ اس کے بعد وہ آپ حضرات کو دے دیا جائے گا۔ لہٰذا آپ سے یہ گزارش ہے کہ ہیکل کے ایک حصے میں بچوں کا ایک ہسپتال قائم کیا جائے جس کے دروازے یہود و عرب دونوں کے بچوں پر یکساں کھلے ہوں اور غریبوں کا علاج مفت کیا جائے۔

مزید برآں ہیکل سلیمانی کی تعمیر مکمل ہونے کے بعد ماسونی بھائیوں کی ممبرشپ کی تجدید کے ذریعے ہر سال آپ کو اپنے اخراجات سے کہیں زائد رقم مل جایا کرے گی۔

میں آپ حضرات پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ امریکی باشندہ ہونے اور اسرائیل کا مہمان ہونے کے ناطے مجھے آپ کی مقامی سیاست سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ میں بیت المقدس میں اپنی ثقافتی فلم کی شوٹنگ کروں گا۔ یہ فلم ماسونی اجتماعات میں دکھلائی جائے گی۔ اس فلم میں ہمارے جدِّ امجد حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت یعقوبؑ سے متعلق مذہبی مقامات، ہیکلِ سلیمان کی تعمیر اور حضرت مسیحؑ کی ولادت سے لے کر ان کی پھانسی تک کے مناظر دکھلائے جائیں گے۔

مجھے پوری امید ہے کہ میرے بیت المقدس پہنچنے سے پہلے ہی آپ سب اراکین مجلسِ انتظامیہ اس مسئلے پر اچھی طرح غور کر لیں گے اور مجھے بالمشافہ گفتگو کرنے کا شرف بخشیں گے۔ دعا ہے کہ خدا آپ کے کاموں میں برکت عطا فرمائے

انڈونیشیا کے سماترا اور جاوا نامی جزائر کے تالابوں میں "وکٹوریا" نامی ایک کنول پیدا ہوتا ہے آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس پودے کی تھالی کی تیلیوں کا قطر چھ فٹ اور خود کنول کے پھول کا قطر چار فٹ ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ اتنے بڑے سائز کے کنول دنیا کے کسی اور حصہ میں پیدا نہیں ہوتے

www.taemeernews.com

جیمس کاٹن

پچاس لاکھ انسانوں کا قاتل

جس کی تلاش آج بھی جاری ہے

مارٹن بارمن اعلیٰ درجے کا جنگی مجرم ہے کبھی ہٹلر کا وہ بااعتماد سکریٹری تھا۔ عام لوگوں کا خیال ہے وہ اب تک زندہ ہے اور نہ معلوم دنیا کے کس حصے میں مقیم ہے مغربی جرمنی کی حکومت نے اس بدنام اور بدکار مجرم کی گرفتاری میں رہنمائی کرنے والے کو پچیس ہزار ڈالر کا انعام رکھا ہوا ہے۔

مارٹن بارمن تاریخ عالم کا انسانوں کے لئے سب سے بےرحم ظالم اور بے درد دشمن ہے۔ ایک عرصے تک باور کیا جاتا تھا کہ وہ مرچکا ہے لیکن اب اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ کہیں زندہ موجود ہے اور اس نے اپنے اصل نام کے بجائے کوئی دوسرا نام اپنایا ہوا ہے۔ مغربی جرمنی کی حکومت چاہتی ہے کہ ایسے ظالم مجرم کے خلاف قانونی طور پر مقدمہ چلایا جائے۔

مارٹن بارمن ہے کون؟ پست قد، مضبوط اور ٹھوس جسم اور گول کندھوں والا آدمی ہے وہ ۱۷ جون ۱۹۰۰ء کو پیدا ہوا اس کا والد جرمن فوج کا ایک ذمہ دار ملازم تھا۔ بارمن پہلے پہل ایگریکلچر سکول میکلین برگ میں تعلیم حاصل کرتا رہا اور پھر برلن کے شمال میں ایک ریاست کے سکول میں تعلیم حاصل کرتا رہا۔

بیس سال کی عمر میں اس نے جیوری آف دی ایس اے پی میں شرکت کی تیئیس سال کی عمر میں وہ نازیوں کے گلا گھونٹ کرانے والے ایک گروہ میں شامل ہوگیا۔ ستائیسویں سال تک وہ ایک

www.taemeernews.com

پرزور اور جذباتی نازی تھا۔ اس کے دو سال بعد اس نے اپنی ہی پارٹی کی ایک عورت سے شادی کرلی اور پھر دونوں میاں بیوی نے عیسائیت کو ٹھکرادیا۔

جلد ہی مارٹن بارمن نے ہٹلر کے ڈپٹی روڈولف ہیس کے سٹاف میں سربراہ کا مقام حاصل کرلیا۔ ۱۹۴۱ میں جب روڈولف ہیس سکاٹ لینڈ چلا گیا تو مارٹن بارمن کو اسی سٹاف کا چیف بنا دیا گیا۔ یہاں پر دو ہی سال کے اندر وہ فیورر کا ایک کامیاب سکریٹری بن گیا۔

بارمن نے یہ تہیہ کرلیا تھا کہ وہ بہرصورت ریکس REICH (RIX) یا جرمن کامن ویلتھ کا ایک لیڈر بن کر رہے گا آخر اس کی یہ آرزو بر آئی۔ اس نے ہٹلر کی میز پر دو سٹینوگرافروں کو متعین کیا ہوا تھا تاکہ وہ اس کی ہر طرح کی بات چیت کو تحریر کریں اور وہ (بارمن) اس سے مکمل طور پر باخبر رہ سکے۔ بارمن نے ہٹلر کو کسی بھی مرحلے پر اکیلا نہ رہنے دیا حتیٰ کہ ہٹلر کے کھانے پینے کے اوقات میں بھی سٹینوگرافر اس کے ساتھ ہوتے۔ فیورر کے چیف ایڈوائزر ہونے کی حیثیت سے اس نے عدلیہ کے قوانین کی تبدیلی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

مارٹن بارمن ۱۹۲۹ سے ۱۹۴۲ تک مختلف کیمپوں کے ہم مسکن جتھوں کو قتل کرنے کے لئے ایک ذمہ دار علمی معاون کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس غلط راہ پر مارٹن بارمن نے ناعاقبت اندیشی میں کم از کم ایک لاکھ آدمیوں کو مروا دیا۔ اس معاملے میں ۱۹۴۱ سے ۱۹۴۵ تک وہ روسیوں، یہودیوں اور زیکوسلاویکیہ والوں کے کئی نازی گروپوں کا مسلمہ علمی مددگار رہا۔ اس سارے مرحلے میں مارٹن بارمن نے جنگی قیدیوں اور دوسرے گھٹیا اور مخالف آدمیوں کو اتنی بڑی تعداد میں مروادیا کہ کہا جاتا ہے کہ اب تک اس نے اپنی ظالمانہ علمی معاونت، بدخواہی، کینہ وری، برے کردار اور جبر و تعدی سے کم از کم پچاس لاکھ انسانوں کو مروادیا۔

مارٹن بارمن کی مجرمانہ ذہنیت کی یہ کوئی معمولی بات نہیں

www.taemeernews.com

کہ جس کے لئے حکومت مغربی جرمنی نے پچیس ہزار ڈالر کا انعام مقرر کر رکھا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کا کیس اس وجہ سے بھی بڑا وحشت انگیز ہے کہ اس نے جرمنی کے خلاف ہٹلر کی رضا جیتنے کے لئے جھلسی، جلی اور بے کار زمینوں کو سدھارنے کے لئے امتیازی کردار ادا کیا ہے۔

رئیس مسلح افواج کے وزیر سپیر کو نیورم برگ کی تباہی کی تجویز پیش کی گئی۔ تجویز یہ تھی کہ تمام صنعتی پلانٹ، سارا برقی نظام آب رسانی کے ذرائع، گیس کمپنیاں، خوراک اور کپڑے کے کارخانے پل اور ریلوے پٹریاں، بندرگاہوں میں دبکے ہوئے جہاز، فریٹ ہنگر اور گاڑیاں وغیرہ سب تباہ کر دی جائیں۔ البرٹ سپیر نے اس سنگ دلانہ ظلم کو لاکھوں جرمن عوام کے بھوکوں مرنے کے ڈر کے پیش نظر نہ مانا تو ہٹلر نے کہا کہ جرمن عوام ان سب آسائشوں کے حق دار نہیں ہیں۔ اس لئے ان سب کو تباہ کر دینا چاہیے جب جنگ ختم ہوئی تو یہ اعلان ہوا کہ یہ حکم ناقابل تردید ہے۔ اس پر مارٹن بارمن نے تحسین کے کلمات کہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۵ کو بارمن نے حکم دیا کہ ذخیرہ شدہ تمام خوراک تباہ کر دی جائے اور عورتوں، بچوں، بوڑھوں کو بھوکے پیٹ مرکزی جرمنی سے دھکیل باہر کیا جائے۔ امن پسند دستوں نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی جو تباہی اس طرح پھیلتی، نہیں تو وہ بھی اپنی قسم کی انسانوں کی واحد تباہی ہوتی۔

انسانوں کے اس قدر بد سگال اور بے دریغ قاتل کی اس بربریت کے مدِ نظر مغربی جرمنی کی عدلیہ کی منسٹری یہ چاہتی ہے کہ نازی ازم کا ذرہ برابر بھی وجود باقی نہ رہے۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ مارٹن بارمن کو ڈھونڈھ کر پُرامن انسانوں کے سامنے لایا جائے اور پھر انسانیت کے اس دشمن کو سزا دی جائے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بارمن مر چکا ہے۔ ۱۹۴۶ میں ہٹلر کے ایک ڈرائیور ایرک کیمکا نے نیورم برگ میں بتایا کہ مارٹن بارمن اور رئیس پراپوگنڈا منسٹری سیکریٹری ڈاکٹر ورنر نایومن کے قریب ۲ مئی ۱۹۴۵ کو جرمنی کا ایک ٹینک پھٹا تو اس طرح وہ دونوں مر گئے۔ ہٹلر کے پائلٹ ہانس بارنے بتایا کہ مارٹن بارمن نے اپنے سنگ دلانہ رویئے اور انسانیت سوز ظلم و ستم کو سوچ کر خودکشی کر لی تھی لیکن اگلے ہی چند برسوں میں یہ افواہ عام ہوگئی کہ مارٹن بارمن زندہ ہے۔ ایک شخص نے اطلاع پہنچائی کہ اس نے بارمن کو غیر فوجی لباس پہنے ہوئے جولائی ۱۹۴۵ میں لیون برگ سے فلنس برگ تک سفر کرتے ہوئے ٹرین میں دیکھا ہے۔ ۱۹۴۶ میں پتہ چلا کہ وہ جرمنی کے یو۔ایس زون میں زندہ موجود ہے۔ ۱۹۴۷ میں سڈنی اور آسٹریلیا سے اس کی خبر ملی۔ ۱۹۴۸ میں روس سے مخبری ہوئی کہ وہ دوبارہ کسی ملازمت پر لگ گیا ہے۔ دریں اثنا ۱۹۴۸ میں اس کی بیوی اٹلی میں مر گئی۔

۱۹۵۰ میں کیمکا اور ورنر نایومن کے دیئے ہوئے بیانات کی قلعی کھل گئی کہ نایومن اور آرٹر ایکس میں ہٹلر کے جوان لیڈروں میں تھے اور وہ دونوں ۲ جولائی ۱۹۴۵ کے ٹینک کے حادثے کے وقت اس کے قریب تھے۔ اس طرح نایومن اور مارٹن بارمن دونوں بچ گئے تھے۔ اس کے اگلے دن بارمن بھلا چنگا تھا۔

ہیز کے فوج داری جنرل فریٹز بائیر نے تین سال تک نازی ازم کے خلاف تحقیق کر کے گزشتہ بیس برسوں کی تاریخ کا جائزہ لیا ہے۔ اس دوران اس نے سیکڑوں لوگوں کے انٹرویوز اور بیسیوں کی گواہیوں سے ایک مفصل رپورٹ مرتب کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مارٹن بارمن آج بھی روسی مقبوضہ جرمنی میں ایک سرگرم نازی کی حیثیت سے کوشاں ہے اور موقع کی تاک میں ہے کہ کب مغربی زون کو مجبور کرے۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ممکن ہے وہ آج کل آسٹریلیا میں ایک سمگلر کی حیثیت سے ڈینمارک ایلپس اور یوگوسلاویہ کی سرحد پر زندگی گزار رہا ہو یہ بھی بعید نہیں کہ اس نے کوئی روپ دھار لیا ہو اور کسی طرح

www.taemeernews.com

یوگوسلاویہ سے اٹلی چلا جائے۔

مارٹن بارمن اس وقت ہے کہاں؟ پیراگوئی، برازیل، ارجنٹائنا اور بولیویہ سے موصول ہونے والی اطلاعات کے مطابق یہ قیاس آرائی کی جاتی ہے کہ وہ انھیں شہروں میں ہوگا۔ دنیا کے ایک یہودی سائمن ویسینتھل بتاتا ہے کہ بارمن آج کل پیراگوئی میں مقیم ہے۔ سائمن کا یہ بھی خیال ہے کہ بارمن کے ساتھ ان دنوں اس کے چار اور مصاحب بھی ہیں، انہیں کی معیت میں وہ دریائے پرانہ کے کنارے پر ہے جہاں سے وہ باآسانی ارجنٹائنا یا برازیل جا سکتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں کی بات ہے کہ پیراگوئی والوں نے اپنے ملک میں نازیوں کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا ہے۔

بین الاقوامی پولیس انٹرپول کی اطلاع کے مطابق بارمن کا کیس ایک سیاسی مقدمہ ہے اس لئے یہ ان کے تعلق سے باہر ہے۔ بین الاقوامی ملٹری ٹربونل نے جو اپنی رپورٹ پیش کی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ مارٹن بارمن اپنے تین نازی قیدیوں کے ساتھ برلن کی جیل سپانڈاؤ میں اسیر ہے۔

اسی اثناء میں لاتعداد دلچسپی رکھنے والوں نے بتایا ہے کہ عین ممکن ہے کہ مارٹن بارمن کہیں نہ کہیں اپنے دوسرے فرضی نام سے زندگی گزار رہا ہو، لیکن ابھی تک کوئی یہ نہیں بتا سکا کہ وہ جرمنی کے قصبہ آئیلوان میں ہے، اسرائیل میں ہے یا کسی دوسرے مغربی ملک میں سر چھپائے ہوئے ہے۔ بارمن کینیڈا میں بھی جا سکتا ہے، میکسیکو بھی اس کے لئے دور نہیں شاید اس نے اسرائیل کے کسی ہوٹل میں ملازمت کر لی ہو، ٹیکسی ڈرائیور بن گیا ہو۔

اس کا مضبوط جسم، پانچ فٹ آٹھ انچ قد، چھوٹی اور موٹی گردن، سلاویکیہ کے لوگوں جیسا بڑا سا سر اور بھوری آنکھیں ہیں اس کے بھورے سیاہ بال آج سے پچیس سال پیشتر ماتھے پر پڑتے تھے، ممکن ہے اب اس نے بال کٹوا دیئے ہوں۔ اس کے عیاش چہرے پر گول سی ناک کسی تاک میں بیٹھی دکھائی دیتی ہے اس کا بڑا سا مونہہ اور پورے ہونٹ ہیں۔ اس کی پہچان کی سب سے بڑی نشانی بائیں کنپٹی پر بڑا سا تل ہے ممکن ہے اس نے اسے بھی اتروا دیا ہو۔ اس کے ہاتھ چوکورے ہیں، جوتے کا سائز ۸½ ہے اور وہ ہر شخص کو باعتماد مطمئن نظروں سے دیکھنے کا عادی ہے۔

مارٹن بارمن بہت جلد باز آدمی ہے لیکن بھڑکے ہوئے جذبات کو بھی کنٹرول کر لیتا ہے۔ مزاج میں تحمل اور مخالفت ہے بارمن جنسی جرائم سے پاک ہے، شراب، کافی، ہلکی چائے اور دوسری نشہ آور چیزوں سے پرہیز کرتا ہے۔

بعض پرندے زمین کی کشش ثقل سے بمبار طیاروں کی طرح ضرور کام لیتے ہیں مثلاً آبی چیلیں سیپ کا کیڑا کھانے کے شوق میں سیپیاں چونچ میں دبا کر اُڑ جاتی ہیں اور بلندی سے کسی چٹان پر دے پٹختی ہیں۔ بلقان کے عقابوں کو کچھوے کا گوشت مرغوب ہے چناں چہ وہ بھی کچھوا پنجوں میں داب کر اونچا اُڑتے ہیں اور جہاں چٹان نظر آئی اس پر دے مارا۔ لیکن فضائی بمباری کے معاملے میں سب سے زیادہ دانش مندی کا مظاہرہ آسٹریلیا کا باز کرتا ہے۔ اس ملک میں شتر مرغ سے ذرا چھوٹا ایک مرغ ایمو پایا جاتا ہے۔ اس کے پانچ انچ لمبے انڈے کا خول بہت سخت ہوتا ہے، چونچ سے توڑا نہیں جا سکتا چکنا اتنا ہوتا ہے کہ پنجوں کی گرفت میں نہیں آتا۔ باز یہ تدبیر کرتا ہے کہ چونچ میں کنکر لے کر فضا میں سے انڈے پر گراتا ہے۔ نشانہ عموماً ٹھیک بیٹھتا ہے کنکر سے انڈے میں سوراخ ہو جاتا ہے اور باز سوراخ میں پنجہ پھنسا کر انڈا لے اُڑتا ہے۔

www.taemeernews.com

رابرٹ نیوس

زخمی ناگ شیر سے کم خطرناک

جہلم اور راولپنڈی کے درمیان ایک قصبہ ہے دینہ۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہی تھا۔ لاہور سے پنڈی جانے والی بسیں تھوڑی سی دیر کے لئے یہاں رُکتی تھیں۔ لوگ باگ اُتر کر جاتے پانی پیتے تھے اور پھر اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جاتے تھے۔ دینہ سے ایک کچی سڑک روہتاس کے قلعے کے نیچے سے گزرتی ہوئی "بڑا گراں" نامی گاؤں تک جاتی ہے۔ یہ گاؤں دینہ سے لگ بھگ چھ سات میل کے فاصلے پر ہے۔ "بڑا گراں" سے ایک سلسلہ ہائے کوہ شروع ہوتا ہے اور اگر آپ وہاں سے شمال کی جانب روانہ ہوں تو بڑے خوب صورت پہاڑی مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ بڑا گراں سے چار میل آگے ٹلہ جوگیاں ہے۔ مختلف خم دار راستوں، تنگ پہاڑی دروں اور خشک نالوں سے گزرنے کے بعد جب آپ ٹلہ جوگیاں کی چوٹی پر پہنچ جائیں گے تو چاروں طرف ایسے ایسے دل فریب مناظر نظر آتے ہیں کہ رُوح ایک انجانی مسرت سے سرشار ہو جاتی ہے اور دل فطرت کے جمال سے مسحور ہو جاتا ہے۔

ان پہاڑوں پر بلند و بالا درخت بہت کم ہیں لیکن یہ سارا علاقہ قد آدم جھاڑیوں اور بڑی بڑی سیاہ چٹانوں سے پٹا پڑا ہے۔ سنا ہے آج کل یہاں کوئلے کی کانیں بھی دریافت ہوئی ہیں۔

۱۹۴۰ء میں مجھے ایک سکھ دوست اندرجیت سنگھ کے ہمراہ جنگل کے شکار کے سلسلے میں اس طرف جانے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں "بڑا گراں" میں ہندوؤں اور مسلمانوں سے زیادہ سکھوں کی آبادی تھی اور وہاں اندرجیت کے ایک چچا مقیم تھے صبح نو بجے ہم نے ایک جھونپڑا ہوٹل سے لسّی کے دو بڑے بڑے گلاس پی کر ہم اور اندرجیت تانگے کی تلاش میں نکلے۔ بڑی دشواریوں کے بعد ایک بوڑھا تانگے والا ۵ روپے کے معاوضے پر بڑا گراں چلنے کے لئے رضامند ہوا۔ سہ پہر کے چار بجے جب سورج کی تپش دم توڑ رہی تھی ہم لوگ "بڑا گراں" پہنچے۔ اندرجیت کے چچا سردار ۔۔۔رجیت سنگھ اپنے مکان کے باہر چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے اندرجیت کو دیکھ کر بڑے تپاک سے آگے بڑھے اور ہم دونوں کا بڑا پرتپاک استقبال کیا۔

وہ رات ہم نے بڑا گراں میں گزاری۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد ۔۔۔رجیت سنگھ جی کا ملازم ہم جو تانگا جوت کر لے

www.taemeernews.com

پڑا گیا اور ہم لوگ اپنی بندوقیں، کچھ کھانے پینے کا سامان اور کچھ فروٹ لاد کر ٹلہ جوگیاں جانے والے راستے پر روانہ ہو گئے ۔

گیارہ بجے کے قریب ہم ایک چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں سے گزرے ۔ گاؤں کی ایک تنگ گلی سے گزرتے ہوئے ہم نے ایک نیم پختہ مکان کے باہر لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا جن کے درمیان ایک بوڑھا جاٹ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر اور منہ پیٹ رہا تھا اور دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا ۔ مکان کے اندر سے بھی عورتوں اور بچوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں قریب جا کر برجو نے تانگا روک دیا ۔

دریافت کرنے پر ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا کہ اس مکان میں ایک نوجوان لڑکے کا سانپ کے ڈسنے سے انتقال ہو گیا ہے اور یہ بوڑھا اس بدنصیب لڑکے کا باپ ہے ۔ اس حادثے کی تفصیل یہ معلوم ہوئی کہ ٹلہ جوگیاں کے قریب ایک پہاڑی کے دامن میں اس بوڑھے کی دو ایکڑ زمین ہے ۔ جہاں باپ بیٹا سبزیاں کاشت کرتے ہیں آج صبح دونوں ناشتہ کر کے خوش و خرم گھر سے کھیتوں کی طرف روانہ ہوئے کھیتوں پر پہنچ کر باپ حقہ پینے کے لئے جھونپڑے کے باہر آگ جلانے میں مصروف ہو گیا اور لڑکا کھرپی لے کر کھیتوں کی طرف چلا گیا، جہاں گاجر، مولی کی فصل تیار کھڑی تھی ۔ کافی دیر تک وہ تنہا کھیت میں کام کرتا رہا اس کے بعد اس کا باپ بھی حقے کی چلم کو پھونکیں مارتا ہوا کھیت کی طرف بڑھا ۔ ابھی وہ پہلی منڈیر پر ہی تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کی ایک دلدوز چیخ سنی "ابا رے ابا میں مرگیا"

بڈھا حقہ پھینک کر بدحواسی کے عالم میں فصل روندتا ہوا جب اپنے بیٹے کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا لڑکا زمین پر گرا ہوا بے تابی کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رہا ہے اس کے منہ سے نیلے رنگ کے جھاگ نکل رہے ہیں اور اس سے چند فٹ کے فاصلے پر ایک کوبرا سانپ اپنا خوفناک پھن پھیلائے بیٹھا ہے ۔ سانپ کو دیکھتے ہی بڈھے نے تمام صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا ۔ اس نے کمر سے اپنی کھرپی نکال کر سانپ پر حملہ کیا ۔ سانپ اتنا نڈر تھا کہ وہ بجائے اس کے کہ کھرپی سے خوف زدہ ہو کر بھاگتا زمین سے چار فٹ اونچا کھڑا ہو گیا اور بوڑھے کے حملوں کا جواب دینے لگا ۔ ادھر بیٹے کی حالت متغیر ہو رہی تھی مجبوراً خوف زدہ بڈھے نے دوسرے کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کو مدد کے لئے آوازیں دیں ۔ کسان درانتیاں اور کلہاڑیاں لے کر دوڑے مگر ان کے آنے سے پہلے چالاک کوبرا پھن سمیٹ کر لیٹا اور بجلی کی طرح مولیوں کے کھیت میں کہیں غائب ہو گیا ۔ بوڑھا تو اپنے نیم جان لڑکے کو کندھے پر لاد کر گھر واپس لے آیا جہاں تھوڑی دیر کے بعد اس نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی مگر وہاں کھیتوں میں کسان اب تک کوبرے کی تلاش میں مصروف ہیں ۔

یہ المناک واقعہ سننے کے بعد ہم لوگ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے گاؤں سے باہر نکل گئے ۔ برجو نے پوری رفتار سے تانگا ٹلہ جوگیاں کے راستے پر ڈال دیا ۔ دائیں بائیں اونچے پہاڑی ٹیکرے تھے اور درمیان میں ریتلی گزرگاہ پر ہمارا تانگہ چل رہا تھا ۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم نے دور سے دیکھا کہ ایک سرسبز پہاڑی کے دامن میں بہت سے لوگ کھیتوں میں چل پھر رہے ہیں ۔ برجو نے بتایا یہی وہ کھیت ہے جہاں وہ بے چارا لڑکا ہلاک ہوا ہے ۔

تانگے سے اتر کر ہم لوگ بھی کوبرے کی تلاش میں شامل ہو گئے ۔ میں نے اور اندرجیت نے اپنی اپنی بندوقیں

www.taemeernews.com

لوڈ کرلیں اور کھیتوں کو چھانتے ہوئے پچھلی پہاڑی تک پہنچ گئے۔ پہاڑی اور کھیتوں کے درمیان ایک خشک ندی تھی جس کی ریت پر مجھے سانپ کی مدھم سی لکیر نظر آئی۔ میں نے اندرجیت کو وہ لکیر دکھلائی اور پھر ہم لوگ اس لکیر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ ندی میں سو ڈیڑھ سو گز چلنے کے بعد وہ لکیر پہاڑی کی طرف گھوم گئی اور چٹانوں کے قریب پہنچ کر پتھریلی زمین پر گم ہو گئی۔

ہم نے بغور چاروں طرف دیکھا۔ یہاں چھوٹی چھوٹی جنگلی جھاڑیوں اور جھربیری کے قدِ آدم پیڑوں کا ایک جھنڈ تھا۔ چند قدم آگے بڑھنے کے بعد مجھے گیلی مٹی پر پھر سانپ کی مدھم سی لہر نظر آئی۔ اب صاف ظاہر تھا کہ سانپ اسی جھنڈ میں رہتا ہے اور یہیں سے باہر نکل کر اس نے اس بدنصیب لڑکے کو ڈسا تھا۔

ہم نے جھنڈ کے چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھا اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو جھربیری کے کانٹوں سے بچ کر اندر پہنچنا ناممکن تھا۔ ہم نے اس جھنڈ کے کئی چکر لگائے۔ اچانک ایک جھاڑی کی اوٹ سے مجھے آکھ کے ایک بڑے پودے کی اوٹ میں بیٹھا ہوا کوبرا نظر آیا۔ وہ کنڈلی مارے پھن سکیڑے جلیبی کی طرح سمٹا ہوا خاموش بیٹھا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اچانک میری نظریں اس پر پڑ گئیں، ورنہ اس کے بیٹھنے کی جگہ اتنی محفوظ تھی کہ اس کا پتہ چلنا ناممکن تھا۔ میں نے کھڑے کھڑے بندوق اٹھا کر اس کا نشانہ لیا کہ میری نظریں جھنڈ کے دوسری طرف کھڑے ہوتے اندرجیت پر پڑیں۔ اگر میں بے خبری میں فائر کر دیتا تو یقیناً اندرجیت بھی چھروں کی زد میں آ جاتا۔ چند لمحوں تک میں سکتے کے عالم میں خاموش کھڑا میں اندرجیت کے اس مقام سے ہٹنے کا انتظار کرتا رہا۔ اندرجیت کے ہٹتے ہی میں نے

پھر آکھ کے پودے کی طرف دیکھا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کیوں کہ کوبرا وہاں سے غائب تھا۔

میں نے انتہائی گھبراہٹ میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ جھاڑیوں کے جھنڈ کا ایک پورا چکر لگا کر ایک ایک جھاڑی کو بغور دیکھا مگر کوبرا کا کہیں پتہ نہیں چلا۔ پھر یہ سوچ کر کہ ممکن ہے اس جھنڈ میں کہیں اس کا بِل موجود ہو۔ بندوق تان کر کانٹوں سے الجھتا ہوا دیوانہ وار اندر داخل ہو گیا۔ جھربیری کے کانٹے میری پتلون کو پھاڑتے ہوئے میرے جسم میں پیوست ہو گئے مگر غم و غصے کے مارے مجھ پر دیوانگی کا سا عالم طاری تھا۔ میں نے جھنڈ کے اندر گھس کر بندوق کی نال سے جھاڑیوں اور شاخوں کو ٹٹولا، وہاں کوئی بِل نہ تھا۔ پھر میں جھاڑیوں سے الجھتا ہوا واپس لوٹا اور ایک چٹان کے قریب کھڑا ہو کر اپنی پتلون سے کانٹے الگ کرنے لگا۔ دوسری طرف اندرجیت چٹانوں اور پتھروں میں کوبرے کی تلاش میں مصروف تھا۔ گو کوبرا مجھے اپنی ایک جھلک دکھا کر غائب ہو چکا تھا مگر لاشعوری طور پر مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اب بھی کہیں قریب موجود ہے اور اپنی کمین گاہ میں اطمینان سے بیٹھا ہوا ہماری ہر نقل و حرکت کا بغور جائزہ لے رہا ہے۔

تعجب کی بات یہ تھی کہ جھنڈ کے باہر زمین پر کوئی لکیر موجود نہیں تھی۔ جھنڈ کے تین طرف نرم بھربھری مٹی کے تودے تھے۔ کسانوں نے کھیتوں کی منڈیریں درست کر کے کچھ مٹی اس طرف اچھال دی تھی۔ صرف ایک سمت پتھریلی زمین تھی جس سے چند گز کے فاصلے پر چٹانوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ سانپ جب مجھے نظر آیا تھا، تو میں اسی مقام پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سانپ جھنڈ سے نکل کر میرے قدموں کے قریب سے رینگتا ہوا

www.taemeernews.com

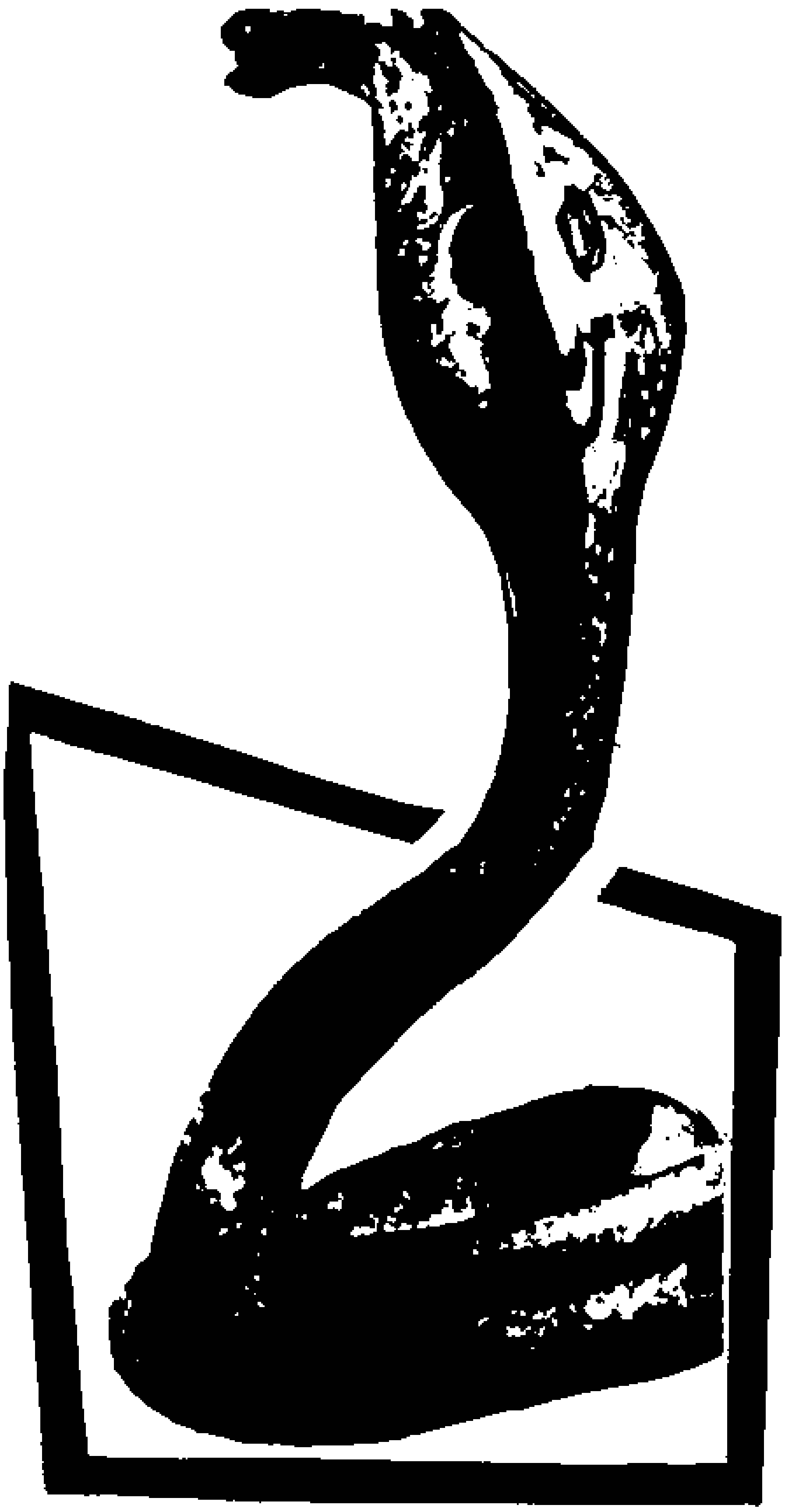

پچھلی چٹانوں میں گھس گیا تھا۔ یہ سوچ کر دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے ۔۔ میں نے گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھتے ہوئے بغور زمین کا جائزہ لیا معاً مجھے اپنی بائیں جانب ایک پتھر کے قریب نرم زمین پر سانپ کی مدھم سی لکیر نظر آئی۔

ابھی میں استعجاب اور تاسف کے عالم میں ادھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے کوبرے کی پھنکار کی آواز آئی۔ ساتھ ہی اندر جیت نے چیخ کر مجھے للکارا "پیچھے دیکھو" میں نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا تو مجھ سے صرف چار فٹ کے فاصلے پر کوبرا ایک چٹان پر اپنا پھن پھیلائے ہوئے کھڑا تھا وہ بلا مبالغہ پانچ فٹ سے کم لمبا نہیں تھا۔ اگر ایک لمحہ اور میں اس کی موجودگی سے بے خبر رہتا تو وہ اس چٹان سے لپک کر میرے جسم کے کسی بھی حصے پر ڈس سکتا تھا۔ میں نے پلٹتے ہی بندوق گھمائی اور شست لئے بغیر اندازے سے نال اٹھا کر فائر کر دیا۔

کوبرا تڑپ کر گرا اور زمین پر اپنا سر پٹخنے لگا اس کا تمام جسم چھلنی ہو چکا تھا مگر اس کا سر ابھی سلامت تھا وہ بار بار سر اٹھا کر خوفناک انداز میں پھنکارتا ہوا میری جانب لپکتا اور پھر آگے بڑھنے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے نڈھال ہو کر گر جاتا۔ اسی لمحہ اندر جیت کے دوسرے فائر نے اس کے سر کے پرخچے اڑا دئے۔

اس دن ہم تیتروں کے شکار کے لئے آگے نہ جا سکے، لڑکے کی میت اٹھنے سے پہلے ہم نے مرے ہوئے کوبرا کو اس کے گھر پہنچا دیا۔ وہ منظر انتہائی دردناک تھا جب لڑکے کے غم زدہ باپ نے اپنے اکلوتے جوان لڑکے کے قاتل کوبرا کو دیکھا تو وہ دیوانہ وار چیختا ہوا اپنی چارپائی سے اٹھا۔ چند لمحوں تک خوں بار نظروں سے سانپ کو گھورتا رہا اور پھر اس کو ہاتھوں میں اٹھا کر اپنے دانتوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے۔

میں نے اس کے بعد بھی اپنی زندگی میں بے شمار زہریلے سانپ دیکھے۔ کئی سانپ مارے بھی لیکن ویسا زہریلا اور خوفناک کوبرا مجھے آج تک نظر نہیں آیا۔

آج بھی اس ناگ کا تصور کرتے ہی میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

www.taemeernews.com

سید بادشاہ حسین

دستخطوں کی قیمت

دوسری جنگِ عظیم سے کئی سال پہلے کی بات ہے کہ ہندوستان کی ایک دولت مند عورت نے دنیا کا سفر محض مشاہیر سے آٹوگراف حاصل کرنے کے شوق میں کیا تھا۔ مسلسل جدوجہد کے بعد اس نے بہت سے مشاہیر کے آٹوگراف حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اپنے تاثرات میں اس نے لکھا:

"مصطفےٰ کمال اتاترک کے آٹوگراف کے لئے جب میں ترکی پہنچی اور ان کے سکریٹری سے ربط قائم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ آسانی سے آٹوگراف نہیں دیتے۔ میں نے مستقل مزاجی سے پیروی کی، اور متعلقہ افراد کو انٹرویو کے لئے یاد دہانی کی۔ کبھی کوئی تاریخ مقرر ہوتی کبھی کوئی۔ کبھی کسی جگہ بلایا جاتا اور کبھی کسی جگہ۔ لیکن ہر دفعہ کسی نہ کسی مصروفیت کی وجہ سے بات ٹال دی جاتی۔ مگر میں ہمت ہارے بغیر ان کے پیچھے لگی رہی۔ اس سلسلے میں ان کے اسٹاف کا ایک افسر میرا ہمدرد ہو گیا تھا۔ اس نے ایک دن چپکے سے کہا کہ تم فلاں مقام پر فلاں وقت اور فلاں تاریخ کو پہنچو۔ وہ دورہ کرتے ہوئے وہاں پہنچیں گے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہوں گا۔ تم کو کسی نہ کسی طرح وہاں ملنے کا موقع دلا دوں گا۔ چنانچہ میں مقررہ وقت پر پہنچ گئی اور اس مہربان نے مجھے ہمت کر کے اتاترک سے ملا دیا۔

میری خواہش سن کر وہ ہنسے اور اپنے مخصوص انداز میں مجھے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر میں اپنی بات پر اڑی رہی۔ آخر کار وہ راضی تو ہو گئے مگر بادلِ ناخواستہ میری آٹوگراف کی کاپی پر دستخط ایسی جھنجلاہٹ کے ساتھ کئے کہ قلم کی نوک ٹوٹ گئی۔ شکر خدا کا کہ دستخط کرنے کے بعد یہ حادثہ ہوا ورنہ ....

مسولینی کے پاس جب میں پہنچی تو وہاں کا رنگ بھی نرالا تھا۔ کسی نے مجھ پر صدا کی کہ بیبیا کون ہو؟ بڑی منت سماجت کے بعد اس کے دفتر میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ اس کی کرسی کے پیچھے ایک چیتے کا بچہ کھلاڑیاں کر رہا ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ غرانے لگا اور میرا دم نکلنے لگا۔ مسولینی کے چہرے پر خستگی کے آثار تھے اس کی پیشانی پر بل تھے اور بڑے غصہ کی حالت میں اس نے میری کاپی لی اور ایسے جناتی دستخط کئے کہ اس کا پورا صفحہ بھر گیا، اور یہ سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے دستخط کئے ہیں یا کچھ احکام نافذ کئے ہیں۔

ہٹلر کے پاس پہنچی تو اس نے بڑی پذیرائی کی۔ اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتا تھا۔ وہ اس قدر تیز چلتا تھا کہ میرا اس کا ساتھ دینا مشکل ہو جاتا تھا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر میں اس کے پیچھے لگی رہی۔ آخر بے زار ہو کر ایک دفعہ

www.taemeernews.com

چلتے چلتے اس نے کاپی لی اور اس پر چلتے چلتے ہی دستخط کئے"۔

مشہور مصنفین میں شیکسپیئر کے دستخط کی سب سے زیادہ قیمت ہے۔ کیوں کہ مشہور ہے کہ اس کے لکھے ہوئے صرف تین خطوط ابھی تک معلوم کئے جا سکے ہیں۔ ان میں ہر خط کی قیمت کا اندازہ دو لاکھ پونڈ کیا جاتا ہے۔ ان خطوط کے علاوہ اس کے دستخط اور کہیں نہیں ملتے۔ تقریباً اسّی سال قبل اس کے گاؤں کے ایک پرانے گھرانے میں ایک شخص نے دعویٰ کیا تھا۔ اس کے خاندانی کاغذوں میں شیکسپیئر کے دو نجی خط ہیں۔ بنا لیکن اس اعلان کے بعد جوق در جوق اس کے ہاں جمع ہوئے اور سبھوں نے خواہش کی کہ ایک دکھائے جائیں مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ احتیاط کے خلاف ہے۔ پھر اس نے شیکسپیئر میوزیم اور برٹش میوزیم والوں سے ان کا سودا کرنا چاہا۔ ان دونوں جگہ کے ماہرین پہنچے۔ مگر جب انہوں نے پیش کردہ خطوط کو دیکھا تو ان کی اصلیت سے انکار کر دیا۔ ٹام (خطوط کے مالک کا یہی نام مشہور تھا) بہت جز بز ہوا اور ایک کہرام برپا کیا بلکہ دشنام طرازی پر بھی اُتر آیا۔ مگر دونوں میوزیم کے ماہرین اپنی بات پر قائم رہے۔ اس پر ٹام نے ہتک عزت کا دعویٰ کرنے کی دھمکی بھی دی، مگر بات نہ بنی۔

امریکہ کے مشہور مصنف ایڈگر ایلن پو کے بھی بہت کم دستخط ملتے ہیں۔ آٹوگراف جمع کرنے والے اس کی تلاش میں امریکہ کے اُن علاقوں کی خاک چھانتے ہیں جہاں پر وہ رہا یا آیا جایا کرتا تھا مگر اس کے دستخطوں میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ آج ان کی قیمت ایک ہزار ڈالر بتائی جاتی ہے۔

پریزیڈنٹ وڈرو ولسن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب وہ ایک امریکی یونی ورسٹی میں پڑھایا کرتا تھا تو اس کے ایک شاگرد نے اپنی آٹوگراف کاپی پر اس کے دستخط لئے تھے۔ ولسن نے طالب علم کو ڈانٹا تھا کہ وہ وقت فضول کاموں میں کیوں ضائع کرتا تھا تو اُس وقت ظاہر ہے کہ نہ تو طالب علم کو اور نہ ولسن کو معلوم تھا کہ امریکہ کا پریزیڈنٹ ہونے والا ہے۔ جب وہ اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوا تو یہ آٹوگراف بڑا قیمتی ہو گیا۔

جارج برنارڈ شا، سب کو معلوم ہے عجیب و غریب قسم کی طبیعت رکھتا تھا۔ عام راستے سے ہٹ کر چلنا، کسی کی پیروی نہ کرنا، کسی کو اپنا مدِ مقابل نہ جاننا، سخت کلامی دل آزاری کی حد تک کرنا، اور کسی کے ساتھ لطف و کرم سے پیش نہ آنا اُس کی چند خصوصیات تھیں لیکن اس میں یہ خصوصیت بھی تھی کہ وہ ہر خط کا جواب دیتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ آپ اگر دو صفحہ کا خط لکھیں تو وہ دو سطر کا جواب دیتا تھا۔ راقم الحروف نے بھی اس سے کوئی تیس پینتیس برس پہلے خط و کتابت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ شروع شروع کے دو چار خط تو اُس نے اپنے دستخط سے بھیجے۔ پھر اس کا جواب سکریٹری کے دستخط سے آیا۔ مجھے خیال گزرا کہ شاید اس کی طبیعت ناساز ہے۔ میں نے مزاج پرسی کی اور توقع ظاہر کی کہ جوں ہی وہ صحت یاب ہو جائے گا۔ اپنے دستخط سے جواب دے گا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس کی سکریٹری نے مجھے اطلاع دی کہ اس کا مزاج اچھا ہے، اور اس نے خط پر عمداً دستخط نہیں کئے۔ کیوں کہ اس کے دستخطوں کی قیمت بڑھ گئی ہے اور اسے اندیشہ ہے کہ کہیں میں اس کی تجارت نہ کرنے لگوں۔

www.taemeernews.com

یہ تو اُن لوگوں کا ذکر تھا جن کو دستخط کرنے آتے تھے اور بعض وجوہ کی بنا پر آٹوگراف کاپیوں پر دستخط عمداً نہ کرتے تھے۔ لیکن میں آپ کو ایک ایسی ہستی کا قصہ سناؤں جس کو دستخط کرنے ہی نہ آتے تھے۔ مشہور ہے کہ سلطان حیدر علی والیٔ میسور پڑھے لکھے نہ تھے اور سرکاری کاغذات پر بھی دستخط نہ فرماتے تھے۔ دستخط کی بجائے وہ ایک لکیر کھینچ دیتے تھے اور بس۔ ایک دفعہ انہوں نے اپنی فوج کی تربیت کے لئے ایک فرانسیسی افسر کو ملازم رکھا تاکہ وہ ان کی فوج کو چاق و چوبند کرے اور جنگ کے نئے طریقوں سے واقف کرائے۔ ایک دن ہوا یہ کہ فرانسیسی افسر چند سرکاری کاغذات لئے پہلی مرتبہ سلطان حیدر علی کے حضور میں پیش ہوا نظم و نسق اور فوج کی تربیت سے متعلق بعض مسائل پر تبادلۂ خیال کرنے کے بعد اُس نے کاغذات سلطان کے حضور میں پیش کئے تاکہ وہ اُن پر دستخط فرما کر احکام جاری فرمائیں۔ سلطان نے حسبِ معمول ان کاغذوں پر تیزی کے ساتھ لکیریں کھینچ دیں۔ فرانسیسی افسر جس کے کان میں پہلے ہی بھنک پڑ چکی تھی کہ سلطان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا اور وہ دستخط تک نہیں کر سکتے اس موقع پر بے اختیار ہنس پڑا۔ سلطان اس کی ہنسی کا سبب سمجھ گئے اور اُس کی بدتمیزی کو بڑی مشکل سے ضبط کر کے کہنے لگے:

"کاغذ پر کھینچی ہوئی لکیر دیکھ کر کیا ہنستا ہے۔ یہ پیشانی کی لکیر دیکھ جہاں قسمت کا ستارہ چمک رہا ہے۔"

تُرکوں کی توپ

دنیا کی سب سے بڑی توپ کون سی ہے؟ اگر دہانے کی چوڑائی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو جدید ترین بھاری میدانی توپیں بھی ترکوں کی اس توپ کا مقابلہ نہیں کر سکتیں جو پانچ سو برس پہلے تیار کی گئی تھی۔ اس کا دہانہ ۲۶۔۴ انچ چوڑا ہے۔ دنیا کی پہلی بندوق چودھویں صدی عیسوی میں ایجاد ہوئی۔ سو برس بھی نہ گزرے تھے کہ ترکوں نے توپ سازی کے فن میں کمال حاصل کر لیا۔ چنانچہ ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کے توپ خانے میں تیرہ بھاری توپیں شامل تھیں، اُن ہی میں یہ ۲۶۔۱ انچ دہانے کی توپ بھی تھی۔ یہ توپ خانہ اصل میں قسطنطنیہ پر گولہ باری کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ ایک توپ کھینچنے کے لئے ساٹھ بیل جوتے جاتے۔ دائیں بائیں دو دو سو آدمی توپ کا رُخ سیدھا رکھتے اور دو سو آدمی آگے زمین کو ہموار کرتے جاتے تھے۔ ان توپوں میں پتھر کے گولے چلتے تھے۔ ایک گولے کا وزن پندرہ من ہوتا تھا۔ اتنی جسامت کے آہنی گولے استعمال کئے جاتے تو ۴۵۔۴ من لوہا خرچ ہوتا۔ لیکن پتھر کے گولے زیادہ آسانی سے تیار کئے جا سکتے تھے اور ان کی نقل و حمل بھی نسبتاً آسان تھی۔ ان دیو ہیکل توپوں نے قسطنطنیہ کی فصیلوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اس کی فتح کے بعد یہ توپیں وہیں رکھ دی گئیں اور ایک مدت تک وہ شہر کے دفاع میں کام دیتی رہیں۔ ۱۸۰۷ء میں ان ہی میں سے ایک توپ نے سات سو پونڈ وزنی گولہ پھینک کر برطانوی امیر البحر کا جہاز تباہ کر دیا تھا۔

م۔ رحیم

نظیر اکبرآبادی

شیخ ولی محمد نام تھا اور نظیر تخلص۔ محمد فاروق کے بیٹے اور دہلی کے باشندے تھے۔ ۱۷۵۳ عیسوی میں پیدا ہوئے۔ ۳۶ برس کے تھے کہ احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا۔ اس ہلچل میں دہلی سے نکلے اور آگرہ پہنچے۔ وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ آگرہ میں روضۂ تاج گنج کے قریب رہتے تھے اور معلمی پر بسر اوقات تھی۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اردو کلیات خاصا ضخیم ہے۔ فارسی میں نو کتابیں تھیں۔ ۲۶ صفر ۱۲۳۶ھ (۱۶ اگست ۱۸۳۰ء) کو آگرہ میں انتقال کیا۔ عبدالغفور شہباز نے اپنی کتاب زندگانی بے نظیر میں ان کے دلچسپ حالات لکھے ہیں۔

نظیر نہایت خلیق، وضع دار، صلح کل، زندہ دل اور بذلہ سنج شاعر تھے۔ جوانی میں نہایت شوقین تھے۔ شہر کے تمام میلے ٹھیلوں، کھیل تماشوں اور جلسے جلوسوں میں شرکت کرتے اور ان کے تجربات سے اندازہ اٹھاتے تھے۔ زبان پر خاصا عبور تھا، قدرت اور تخیل میں بلا کی وسعت تھی ——— انہوں نے ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ——— زندگی کا کوئی پہلو، معیشت و معاشرت کا کوئی انداز، احساس و تاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں جو ان کے کلام میں موجود نہ ہو۔ وہ نہایت ذہین، تیز فہم اور زود گو تھے۔ بات بات پر بڑی بڑی نظمیں کہہ دینا ان کے نزدیک معمولی بات تھی۔ اشیا کے ہر رُخ، ہر پہلو اور زاویہ کو پیش کرنے میں انہیں کمال حاصل تھا۔ شہر کی مشہور چیزوں، کھانوں، عمارتوں، میلوں

www.taemeernews.com

تماشوں، تہواروں اور بازی گروں وغیرہ کا آنکھوں دیکھا حال لکھ کر مصوری اور جزئیات نگاری کا حق ادا کیا۔ دنیا کی بے ثباتی، اہلِ جہاں کے طور طریقوں، رسم رواج، دولت، مفلسی، چوری، عیاشی، تماش بینی، بھنگ چرس موسموں کے تغیر و تبدل اور مناظر قدرت کو کئی کئی رنگوں میں پیش کر کے ہمہ گیری کا ثبوت دیا۔

نظیر کے ہاں لفظوں کی وہ افراط ہے کہ ایک ذخار دریا موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ معانی کی وہ بہتات کہ شہوار موتیوں کا انبار نظر آتا ہے۔ بیان کی سلاست ایسی کہ کہیں رکاوٹ کا نام نہیں۔ بندش کی وہ چستی کہ کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔ تصویر کشی اور محاکات کا یہ عالم ہے جب تاج گنج کے روضہ کی تعریف ہم پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں اس کے ایک ایک نقش و نگار اور ایک ایک جالی کو دیکھ لیتی ہیں۔ جب ریچھ والے کی تعریف نظر آتی ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک قلندر کان چھدائے سر پہ بڑا سا پگڑ باندھے ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لئے ریچھ کے بچے کی نکیل پکڑے اس کو نچا رہا ہے اور اپنے سونٹے سے اس کو سدھا رہا ہے۔ دنیا کی بے بقائی اور عالم کی بے ثباتی کے افسانے سامنے آتے ہیں تو دل کو یقین آجاتا ہے کہ روپیہ، پیسہ، دھن دولت، مال و اسباب سب ہیچ، ہم اور ہماری خواہشات لایعنی۔ ہماری بود بے بود، ہماری ہستی عین فنا ہے۔ دیوالی کی تعریف پڑھتے ہیں تو ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں کہ در و دیوار پر چراغاں ہے۔ مٹھائی کی دوکانیں سجی ہوئی ہیں۔ بھڑبھونجے کھیلیں بیچ رہے ہیں۔ دنیا کی رسم و رواج کے پابند رومالوں میں کھیلیں باندھ باندھ کر لے جارہے ہیں۔ جواری اپنے اپنے اکھاڑوں میں اٹھتے ہوتے ہیں۔ چھکے، تو آٹھ کے داؤوں کی آوازیں بلند ہوئیں شوقین مزاج گھوم رہے ہیں۔ بازار کی رونق کا لطف اٹھا رہے ہیں بعض بڈھے اپنے بچوں کی انگلی پکڑے دوکان دوکان دکھاتے پھر رہے ہیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ غرضیکہ اسی طرح ہر ایک نظم میں جزئیات سے بحث کرنا نظیر کا خاص حصہ ہے۔"

(تذکرہ خندۂ گل صفحہ ۲۲۹-۲۲۸)

نظیر کو اردو کی نیچرل شاعری کا موجد مانا جائے یا نہ مانا جائے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ان کے فنِ تقابل و تماثل کو اردو میں نظیر کے سوا شاید آج تک کسی دوسرے نے نہیں برتا۔ ان کی ظرافت کا کمال یہی بات سیدھے بھاؤ کہہ دینے میں ہے۔ وہ بقول نیاز فتحپوری چٹکلہ باز تھے۔ دل کی لگن سے زیادہ دل لگی ان کا شیوہ تھا۔ نظیر اردو کے شاید تنہا عوامی شاعر ہیں جو مقامی بھی ہیں۔ انہیں ہنس ہنس کر وار کرنا خوب آتا ہے۔ نظیر کے یہاں طنز و ظرافت کا بڑا اچھا امتزاج ہے۔ اچھا اس لئے کہ اس میں ہر قسم کا طنز اور ہلکی پھلکی ظرافت صرف کی گئی ہے اس کا مزاج بڑا ہی خوشگوار ہے۔ شگفتگی میں تلخی کی ایسی آمیزش جو مذاق صحیح کو ناگوار نہ ہو، بڑے سلیقے کا کام ہے۔ نظیر میں یہ سلیقہ ہے اور اس کو ایک ماہر فن کار کی طرح انہوں نے برتا ہے۔ "آدمی نامہ" نظیر کی مشہور نظم ہے۔ یہ تقابل طنز کی بہترین مثال ہے۔ اردو تو کیا شاید دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی مشکل ہی سے اس کے ہم پایہ کوئی نظم پیش کی جاسکے۔ سودا کے طنز کی دنیا جتنی تنگ اور محدود تھی نظیر کی اتنی ہی وسیع اور نامحدود ہے۔ سودا کا فن طنز کا فن ہے۔ ظرافت اس کا ایک رنگ ہے۔ نظیر کا فن ظرافت کا فن ہے۔ طنز اس کا آہنگ ہے۔ نظیر نے کسی کی ہجو نہیں کی۔ اس کے لہجے

www.taemeernews.com

میں نرمی، لوچ اور دھیما پن ہے۔ سوداؔ خاکہ بنا کر رنگ بھرتے ہیں اور کسی رنگ کا بڑا سا دھبہ ڈال کر تصویر کو مضحک بنا دیتے ہیں۔ نظیرؔ آئینہ بند ہیں۔ انہوں نے چاروں طرف آئینے نصب کر کے ایک چیز کے مختلف پہلو روشن کئے۔ ان پہلوؤں کا تضاد چٹکیاں لیتا اور گدگداتا ہے۔ اور ہماری حسِ لطیف کو جگاتا ہے۔ نظیرؔ نے ایک تماشائی کی طرح جس طرح دنیا کو دیکھا دوسروں کو دکھایا۔ ان کی نظر سیر کرتی، ہر منظر سے لطف اٹھاتی اور ہر کیفیت سے حظ حاصل کرتی ہے۔ نظیرؔ کی ظرافت ہلکی پھلکی اور خوشگوار ہے۔ وہ ہنسی کو خوشی پر، تعریض کو طعن پر، مسرت کو ٹھٹھول پر ترجیح دیتے ہیں۔

نظیرؔ کے یہاں زندگی کی اہمیت ہے ان کا اجتماعی شعور بہت تیز تھا۔ سماج کا کوئی پہلو ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہوا۔ ان کی نظر تفصیلی ہے۔ وہ ایک ہوشیار نشتر زن کی طرح فساد کو دیکھ کر نشتر استعمال کرتے ہیں، لیکن ان کی نظر میں حکیمانہ گہرائی نہیں۔ وہ فساد کی اصلی وجہ نہیں جانتے۔ انہیں زندگی اور اس کی رنگینیاں پیاری ہیں۔ وہ اس کا رس نچوڑنا چاہتے ہیں۔ شاید اسی لئے فساد پہ ان کی نظر پڑ جاتی ہے۔ زندگی کی رنگا رنگی کو انہوں نے تفصیل کے ساتھ پیش کیا اور یہ ان کی شاعری کا وہ پہلو ہے جو سب سے الگ ہے۔ ان کے فکر و فن کی ہم آہنگی کا راز یہ ہے کہ وہ زبان پر بلا کی قدرت رکھتے ہیں اور ان کی نظر میں غضب کی وسعت ہے۔ نظیرؔ کا کمال ہے کہ اس نے زندگی کے متنوع اور گوناگوں رنگوں کے تقابل سے مزاح اور طنز پیدا کیا۔ دوسرے شعراء نے رنگ کو شوخ اور گہرا بنا کر اثر پیدا کرنا چاہا نظیرؔ نے مختلف رنگوں کے پس منظر سے یہ کام لیا۔ لیکن طنز کی شدت اور تیزی ان کے یہاں نہیں اور شاید اس لئے نہیں کہ وہ نفرت کرنا نہیں جانتے۔ وہ منگا کر سکتے ہیں تشہیر کر سکتے ہیں لیکن سر بازار جوتے مارنا اور ذلیل کرنا کسی طرح انہیں گوارا نہیں۔

ذیل کے اشعار میں ملّا پر تعریض ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ملّا جو دینے فاتحہ گھر گھر میں جاتے ہیں
حلوا کہیں کہیں وہ چپاتی اڑاتے ہیں
مفلس کوئی بلاوے تو منہ کو چھپاتے ہیں
شکر کا حلوا سنتے ہی تو دوڑے جاتے ہیں
کہتے ہوئے یہ دل میں اہا ہاری شب برات

وہ دیکھ شیخ کو لاحول پڑھ کے کہتا ہے
یہ آئے دیکھئے داڑھی لگاتے سن کی سی

نظیرؔ نے بعض واقعات اور پُر آہنگ الفاظ کی صوتی کیفیت سے بھی مزاح کا رنگ رچایا ہے۔ اس کی ان کے یہاں بے شمار مثالیں ہیں۔ جانوروں کی بولیاں انسان کے اضطراری بولوں کی طرح مضحک ہوتی ہیں، صوتی اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی۔ نظیرؔ نے ان سے بھی کام لیا اور چوں چوں، کوں کوں، کڑ کڑ، سی سی، ہی ہی، ہا ہا، ہو ہو سے کلام کو چٹپٹا بنایا۔ لفظی رعایتوں کی بھی ان کے یہاں کمی نہیں "کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ" "پیسہ نہیں تو آدمی چرخے کی مال ہے" "کوڑی نہ ہو تو کوڑی کے پھر تین تین ہیں" اس کی چند مثالیں ہیں۔

انوکھی تشبیہات کے استعمال سے بھی ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ ککڑی کی چند تشبیہیں ملاحظہ ہوں۔

www.taemeernews.com

فرہاد کی نگاہیں شیریں کی ہنسلیاں ہیں
مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں
ٹیڑھی ہے سو تو چوڑی وہ ہیر کی ہری ہے
سیدھی ہے سو وہ یار رانجھے کی بانسری ہے

نظیر کی ظرافت اگرچہ ہزل اور بعض دفعہ فواحش کی حد تک پہنچ جاتی ہے مگر ان کے الفاظ کا چناؤ اور خیالات کی تازگی اس کو بے مزہ اور پھیکا نہیں ہونے دیتی۔ ان کی طویل نظموں کے جستہ جستہ ٹکڑے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں ؎

آدمی نامہ

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ابدال غوث قطب ولی آدمی ہوئے
منکر بھی آدمی ہی ہے اور کفر کے بھرے
کیا کیا کرشمے کشف و کرامات کے کئے
حتیٰ کہ اپنے زور و ریاضت کے زور سے
خالق سے جا ملا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

فرعون نے کیا تھا جو دعویٰ خدائی کا
شداد بھی بہشت بنا کر ہوا خدا
نمرود بھی خدا ہی کہاتا تھا برملا
یہ بات ہے سمجھنے کی آگے کہوں میں کیا
یاں تک جو ہو چکا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآن اور نمازیاں
اور آدمی ہی ان کی چراتے ہیں جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

بڑھاپا

آگے تو یہ پریزاد یہ کہتے تھے ہمیں گھیر
آتے تھے چلے آپ جو لگتی تھی کہیں دیر
لو آکے بڑھاپے نے کیا اور یہ اندھیر
جو دوڑ کے ملتے تھے وہ اب لیتے ہیں منہ پھیر
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

ہم بھی تھے جوانی میں بہت عشق کے پورے
وہ کون سے گلرو ہیں جو ہم نے نہیں گھورے
اب آکے بڑھاپے نے کئے ایسے ادھورے
پر جھڑ گئے دُم اُڑ گئی پھرتے ہیں لنڈورے
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

تندرستی

جب تندرستیوں کی رہیں دل میں بستیاں
پھر سو طرح کے عیش ہیں اور مے پرستیاں
کھانے کو نعمتیں ہوں دیا فاقہ مستیاں
سب عیش اور مزے ہیں جو ہوں تندرستیاں
جتنے سخن ہیں سب میں یہی ہے سخن درست
اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

www.taemeernews.com

مصنف: او ہنری
مترجم: افسانہ شاہین

باسی ڈبل روٹی

بازار کے موڑ پر مس مارتھا میکم کی چھوٹی سی بیکری تھی جس میں داخل ہونے کے لئے تین زینے طے کرنا پڑتے تھے اور جس کا دروازہ کھولتے ہی گھنٹی بجنے لگتی تھی۔ مس مارتھا کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی دو ہزار ڈالر بینک میں جمع تھے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اگر کچھ تھا تو دو مصنوعی دانت اور ایک ہمدرد دل تھا۔ بہت سے اس قسم کے لوگ شادیاں رچا چکے تھے۔ جن کے بیاہے جانے کے امکانات مس مارتھا سے کہیں کم تھے۔

ہفتہ میں دو یا تین بار اس کی بیکری میں ایک ایسا بھی گاہک آتا جس میں وہ قدرے دلچسپی لینے لگ گئی تھی۔ وہ بھی چالیس کے پیٹے میں تھا۔ چشمہ لگاتا تھا اور اس کی بھوری نوکیلی داڑھی بڑی احتیاط سے ترشی ہوئی تھی۔ انگریزی بولتا مگر جرمن لہجے میں۔ کپڑے بوسیدہ اور اکثر جگہوں پر پیوند لگے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے ابھی نکے سے نکال کر زیب تن کئے ہیں مگر وہ صاف ستھرے اور اعلیٰ اخلاق کا مالک تھا۔

وہ جب بھی آتا دو باسی ڈبل روٹیاں خریدتا۔ اور ڈبل روٹی پانچ سینٹ کی دو ملتی تھیں۔ وہ جب بھی آتا وہ باسی ڈبل روٹیوں کے علاوہ کبھی کچھ نہ خریدتا تھا۔ ایک بار مس مارتھا نے دیکھا کہ اس کی انگلیوں پر سرخ اور کتھئی رنگ کے دھبے تھے اسے یقین ہو گیا کہ وہ مصور ہے اور بے حد غریب ہے۔ بے چارہ کسی متعدد منزلہ مکان کے ایک تنگ و تاریک سے کمرے میں رہتا ہوگا اور باسی ڈبل روٹی پر گزارہ کرتے ہوئے مس مارتھا کی بیکری میں سے لذیذ چیزیں کھانے کی سوچتا ہوگا۔

اکثر جب مس مارتھا چائے کے ساتھ کریم رول گوشت کے قتلے اور سیب کا مربہ کھانے لگتی تو سرد آہ بھرتی اور سوچا کرتی کہ کاش وہ با اخلاق مصور بھی اس کے کھانوں میں شریک ہو سکتا اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مس مارتھا کا دل ہمدردی کے جذبات سے لبریز رہا کرتا تھا۔ اس کے پیشے کے متعلق مس مارتھا نے قیاس

لگایا تھا۔ اُسے ثابت کرنے کی غرض سے ایک دن وہ اپنے کمرے سے ایک تصویر اُٹھا لائی اور اُسے کاؤنٹر کے سامنے لٹکا دیا۔ یہ تصویر اُس نے ایک نمائش سے خریدی تھی۔ وینس شہر کا ایک منظر تھا۔ سامنے ایک پُرشکوہ مرمریں محل تھا۔ پس منظر میں وینس کی مشہور کشتیاں "کنڈولا" تیرتی پھرتی تھیں۔ ایک کنڈوا میں ایک حسین عورت بیٹھی تھی جس نے اپنے ہاتھوں کو پانی میں ڈبو رکھا تھا۔ ابر پارول، آسمان، روشنی اور سایوں کی تصویر کشی بڑے ہنر سے کی گئی تھی۔ کوئی بھی فن کار اسے نظر انداز کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ دو ہی روز بعد وہ گاہک آیا اور دو باسی روٹیاں طلب کیں۔ اتنے میں اس کی نگاہ تصویر پر پڑ گئی "آپ کی یہ تصویر بے حد خوبصورت ہے"۔ وہ ڈبل روٹیاں پیک کرنے میں مصروف تھی کیا۔

"واقعی ایسی فن پر جان دیتی ہوں۔ تصویروں پر بالخصوص" اُس نے جملہ مکمل کیا "کیا واقعی یہ تصویر خوبصورت ہے؟"

"ہاں مگر محل کی ڈرائنگ خوب نہیں ہے اور پھر حجم اور فاصلے میں تناسب بھی درست نہیں۔" اُس نے پیکٹ پکڑا۔ ذرا سا جھکا اور صبح بخیر کہہ کر جلدی سے باہر نکل گیا۔ "بلاشبہ وہ ایک تصویر نگار ہی ہے"، مس مارتھا نے تصویر اٹھائی اور اپنے کمرے میں واپس لے گئی۔

اب جب کبھی وہ آتا، شوکیس کے دوسری طرف ایستادہ مس مارتھا سے چند نام قسم کی باتیں ضرور کرتا اور اکثر یہ کوشش کرتا کہ مس مارتھا سے چند نرم ہمدردی اور محبت سے پُر الفاظ سنے۔ مگر روٹی وہ اب بھی وہ باسی ہی خریدتا۔ نہ کبھی اس نے کیک خریدے اور نہ ہی مزیدار لذیذ پیسٹریوں کا تو شاید اُسے ذائقہ بھی معلوم نہ تھا۔ اب ادھر کئی روز سے وہ دُبلا اور غم زدہ سا نظر آ رہا تھا۔ مس مارتھا کا جی چاہتا کہ باسی ڈبل روٹی کے پیکٹ میں کوئی اچھی کھانے کی چیز بھی شامل کر دے۔ مگر مین باسی ڈبل روٹیاں پیک کرتے وقت اس کی ہمت جواب دے دیتی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کے بعد اس کا سامنا وہ کیسے کر سکے گی۔ اُسے یہ معلوم تھا کہ فن کار کس قدر خودار اور مغرور ہوا کرتے ہیں۔

اب کاؤنٹر پر کھڑے ہونے کے وقت مس مارتھا نیلے دھبوں والا ریشمی بنٹی کوٹ زیب تن کرنے لگ گئی تھی اور پچھلے کمرے میں ایک عجیب سا ابٹن تیار کرتی رہتی تھی۔ اس وقت بہت سے لوگ رنگت نکھارنے کے لئے یہ استعمال میں لایا کرتے تھے۔ ایک روز حسب معمول گاہک آیا۔ رقم کاؤنٹر پر رکھی اور باسی ڈبل روٹیوں کا انتظار کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مس مارتھا جوں ہی ڈبل روٹیاں اٹھاتے مڑی باہر سڑک پر زبردست شور اٹھا۔ اور آگ بجھانے والا انجن شور مچاتا گزر گیا۔ ایسے موقع پر خواہ کوئی بھی ہوتا ضرور دوڑ کر دیکھتا۔ مصور باہر کی طرف دوڑا۔ مس مارتھا کے دل میں بجلی کی طرح ایک خیال کوندا اور یقیناً اس نے موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ کاؤنٹر کے پیچھے سب سے نچلے خانے میں ایک پاؤنڈ تازہ مکھن پڑا ہوا تھا۔ ڈبل روٹی کاٹنے کی چھری سے مس مارتھا نے دونوں باسی ڈبل روٹیوں میں بڑے بڑے شگاف کئے اور بڑی فیاضی سے ان میں مکھن بھر دیا۔ جب گاہک لوٹا تو وہ ڈبل روٹیوں کو کاغذ میں باندھ رہی تھی۔ اس روز غیر معمولی شگفتگی اور شائستگی سے اس کے جانے کے بعد مس مارتھا مسکرائی مگر ساتھ ہی اس کا دل زور سے دھڑکا بھی۔ کیا یہ مس مارتھا کی ضرورت

www.taemeernews.com

سے زیادہ جرأت نہ تھی؟ نہیں وہ ناراض تو نہیں ہو جائے گا؟ مگر نہیں، یقیناً نہیں۔ بھلا خورد و نوش کی چیزوں کی بھی کوئی زبان ہوتی ہے! مکھن ایک دوشیزہ کی غیر شائستگی کا غماز نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں!

اس روز وہ کافی دیر تک اسی موضوع پر سوچتی رہی۔ ذہن ہی ذہن میں اس نے تصویر بنائی کہ گاہک کو بھلا مکھن کے بارے میں کیسے علم ہوا ہوگا۔ اس نے برش اور رنگ ایک طرف رکھ دیئے ہوں گے سامنے اپنا ایستادہ ہوگا جس میں نصب زیر تکمیل تصویر کا فاصلہ اور حجم کا تناسب تنقید سے مبرا ہوگا۔ اس نے لنچ کی تیاری کی ہوگی خشک اور باسی ڈبل روٹی اور پانی کا لنچ اور جب اس نے ڈبل روٹی کا ٹکڑا کاٹا ہوگا، اوہ! مس مارتھا شرما گئی ـــ کیا وہ اس کے ہاتھ کے بارے میں سوچے گا جس نے مکھن وہاں رکھا؟ کیا وہ ـــ سامنے کے دروازے کی گھنٹی بری طرح گونجی کوئی بے حد شور مچاتا ہوا اندر داخل ہوا تھا۔ مس مارتھا دوڑ کر سامنے کے دروازے کی جانب گئی۔ دو آدمی تھے۔ ایک جوان، جو پائپ سلگائے ہوئے تھا اور دوسرا اس کا اپنا مصور تھا مصور کا چہرہ خوفناک حد تک سرخ تھا۔ ہیٹ سر کے پیچھے لٹک رہا تھا اور بال وحشیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے دونوں مکے مس مارتھا کی طرف لہرائے۔ اور وحشیانہ انداز میں جرمن زبان میں گرجا۔

"کتیا۔ ذلیل مکڑی" یا کچھ اسی قسم کے الفاظ تھے نوجوان نے کوشش کی کہ اسے گھسیٹ کر پرے لے جائے "میں نہیں جاؤں گا۔ میں اس نابکار عورت کو بتاؤں گا" اور اس نے کاؤنٹر کو ڈھول کی طرح پیٹ ڈالا "بوڑھی بلی تو نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ میں تجھے مزا چکھاؤں گا۔" اس کی نیلگوں آنکھیں چشمے کے پیچھے چمک رہی تھیں مس مارتھا بیماروں کے سے انداز میں الماری کی طرف جھکی اور ایک ہاتھ سے سہارا لیا اس کا دوسرا ہاتھ نیلے دھبوں والے ریشمی کوٹ پر تھا نوجوان نے اپنے ساتھی کو گریبان سے پکڑ کر کھینچا۔

"بس اب کافی بک چکے ہو، چلو!" اور بدقت تمام اسے گھسیٹ گھسیٹ کر دروازے سے باہر لے گیا۔ کچھ دیر بعد وہ نوجوان لوٹا اور مس مارتھا سے مخاطب ہوا۔

"مادام آپ حیران ہوں گی کہ یہ سب بکواس کیا تھی۔ اصل میں اس شخص کا نام بلبرگر ہے اور تعمیراتی نقشہ نویس ہے۔ میں اس کے ہمراہ دفتر میں کام کرتا ہوں۔ گزشتہ تین مہینوں سے وہ ایک نئے سٹی ہال کا نقشہ تیار کرنے پر سخت محنت کر رہا تھا اور یہ انعامی مقابلہ تھا۔ کل ہی اس نے لائنوں پر سیاہی پھیرنے کا کام مکمل کیا تھا آپ یقیناً جانتی ہوں گی کہ نقشہ نویس پہلے پنسل سے نقشہ بناتا ہے اور پھر مکمل ہو جانے کی صورت میں باسی ڈبل روٹی کے ٹکڑوں سے رگڑ کر پنسل کی لکیریں مٹا دیتا ہے یہ ہندوستانی ربڑ سے بہتر رہتی ہے۔ بلبرگر غالباً یہاں سے باسی ڈبل روٹی خریدتا ہے۔ لیکن آج۔ آپ جانتی ہیں مادام کہ مکھن۔ خیر تو بلبرگر کے ارادے کچھ نیک نہیں ہیں وہ چاہتا ہے کہ ریل گاڑی کے نیچے آ جائے۔"

مس مارتھا عقبی کمرے میں گئی۔ نیلے دھبوں والا ریشمی پیٹی کوٹ اتار کر پرے پھینک دیا اور پرانا بھورے رنگ کا سرج کا پیٹی کوٹ زیب تن کر لیا اور پھر وہ عجیب سا ابٹن، جو وہ تیار کر رہی تھی اٹھا کر کھڑکی سے باہر انڈیل دیا۔

www.taemeernews.com

پھلوں کا بادشاہ

حکیم محمد ارشد

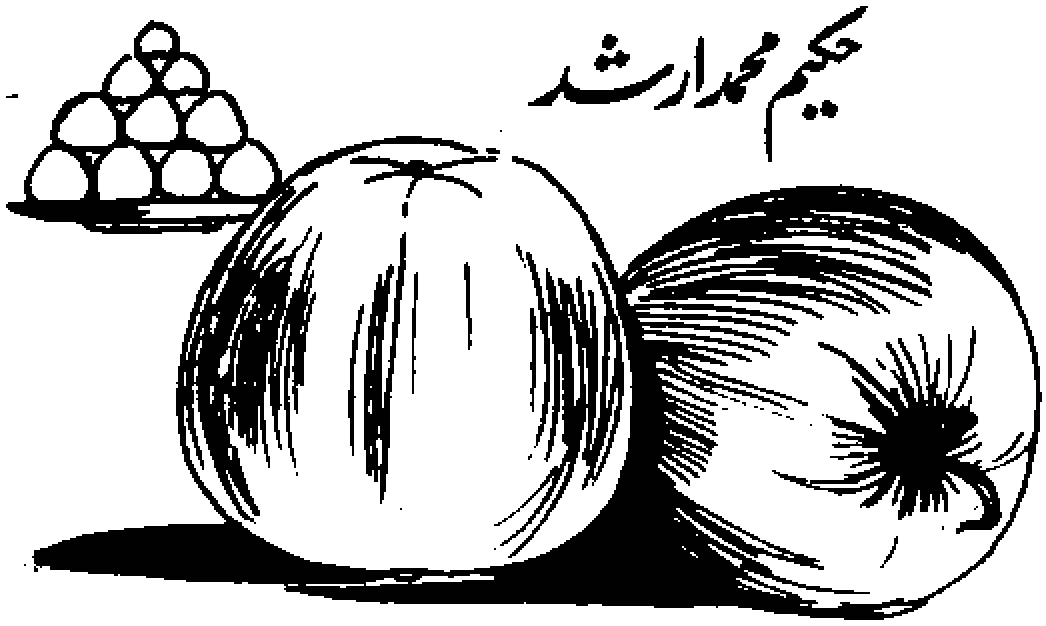

جنھوں نے یورپ کے مشہور نوبل پرائز یافتہ ادیب گالزوردی کا شاہکار سیب کا درخت پڑھا ہے ان کے دل و دماغ پر تو بہت ممکن ہے کہ سیب کا نام سنتے ہی ایک ٹریجڈی طاری ہو جائے مگر جنھوں نے قندھاری سیبوں کی مسرور افروز لذت سے کبھی اپنے کام و دہن کو آشنا کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ٹریجڈی کبھی بھول کر بھی سیب کے پاس نہیں پھٹک سکتی اور سیب کھانے والوں کے تو کہنے ہی کیا ہیں۔ وہ تو ازل ہی سے ٹریجڈی پروف ہونے کا تمغہ لے کر آتے ہیں۔

قندھاری سیب دیکھا ہے کبھی آپ نے؟۔ کیسا سرخ و شاداب ہوتا ہے اس کا رنگ بس اس کے استعمال کرنے والوں کے چہروں پر بھی یہی شوخ و شاداب رنگ کھیلنے لگتا ہے صحت و شباب اور تندرستی و تنومندی کا ایک شاداب نمونہ! بھلا یہاں ٹریجڈی کہاں؟ ٹریجڈی تو اُن پر حملہ آور ہوتی ہے جن کے دل و دماغ کمزور ہوں مگر سیب تو دل کو شگفتہ اور دماغ کو تر و تازگی بخشتا ہے۔ اس کی خوشبوؤں ہی سے ٹریجڈی کوسوں دور بھاگتی ہے۔ گالزوردی بھول گیا وہ درخت جس کی شاخوں تلے ٹریجڈی نے جنم لیا خواہ اور کوئی بھی درخت کیوں نہ ہو مگر ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ سیب کا درخت ہرگز نہ تھا۔

گزشتہ چند سال کی بات ہے کہ امریکہ میں ماہرینِ اشجار کا ایک اجلاس ہوا۔ اس میں سیب کو اس کے کثیرالفوائد اور صحت بخش ہونے کی وجہ سے متفقہ طور پر دنیا کے تمام پھلوں کا بادشاہ قرار دیا گیا ہے اور انگور کو شہزادہ۔

ماہرینِ اشجار نے اب تک سیب کی پندرہ سو قسمیں دریافت کی ہیں۔ صرف کشمیر ہی کے چھوٹے سے خطہ میں پچاس قسم کے سیب پیدا ہوتے ہیں۔

سیب میں نصف حصہ ٹھوس ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ تر کھانڈ اور پروٹین ہوتا ہے۔ جو مختلف قسم کے سیبوں میں مختلف نسبت سے پایا جاتا ہے۔ سیب میں فاسفورس دیگر تمام پھلوں اور سبزیوں سے زیادہ مقدار میں پائی جاتی ہے۔ سیب کا چھلکا اتار دینا سیب کے ایک بہت قیمتی جزو کو پھینک دینے کے مترادف ہے۔ سیب کے چھلکے کی موٹائی میں وٹامن سی بہت بڑی مقدار میں پائی جاتی ہے۔ اس لئے سیب کے اکسیری فوائد سے پورے طور پر مستفید ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا چھلکا جدا نہ کیا جائے۔

www.taemeernews.com

سیب ایک نہایت ہی صحت افزا غذا اور ایک نہایت طاقت بخش غذا ہے اس کے متواتر استعمال سے صحت وشباب میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ روزانہ نہار منہ تین چار سیب کھا کر اوپر سے دودھ پیا جائے تو دو ایک مہینوں میں ہی صحت قابلِ رشک بن جاتی ہے۔ چہرے پر سُرخی کی لہر دوڑ جاتی ہے اعضائے رئیسہ کی تمام کمزوریاں دور ہو کر ان میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑنے لگتی ہے سیب معدے میں جا کر پیپسین کو تیز کرتا ہے اور ہاضمہ میں مدد دیتا ہے۔ خالی معدہ سیب کھانا بھوک بڑھاتا ہے۔ رات کو سوتے وقت اور صبح نہار منہ تین چار سیب کھانا قبض کُش اثر رکھتا ہے۔ خون کی پیدائش کا عمل بڑھ جاتا ہے جس سے صحت بدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ کمزوریٔ معدہ وجگر کو دور کرنے کے لئے کھٹا سیب زیادہ مفید پایا گیا ہے۔ دماغی کام کرنے والے اصحاب کے لئے سیب ایک نعمتِ خداداد ہے۔ سیب میں فولاد کا جزو پایا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ سُرخ ذرّے میں اضافہ کرتا ہے۔ سیب کے مقوی قلب خواص تو زمانۂ قدیم سے مسلّمہ چلے آتے ہیں اور زمانۂ حاضرہ میں بھی یونانی طبیب اپنے مریضوں کو قلب کے لئے سیب کا مربّہ بکثرت استعمال کراتے ہیں۔ سیب کا عرق معدے اور انتڑیوں کے لئے دافع جراثیم اور بدبو ہے گردوں کو صاف کرنے کے لئے طبی دُنیا نے اس کے مفید اثرات کا اعتراف کر لیا ہے۔ سیب کے چھلکے سے نہایت لذیذ اور خوشبودار چائے تیار ہوتی ہے جو عام چائے قہوہ اور کافی کی طرح مضرت رساں ہونے کی بجائے حد درجہ صحت بخش پائی گئی ہے۔ خصوصیت سے بوڑھے اور کمزوروں کے لئے تو اس کا اثر بہت قوی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں اگر حسبِ ضرورت اور حسبِ ذائقہ لیموں کا رس اور شہد ملا لیا جائے تو اس کے صحت بخش اجزا میں تین گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ چائے ہیضہ اور بخار محرقہ کی کمزوریوں کو دور کرنے کے لئے مشہورِ عام۔ مقوی مشروب اور ٹانک کا کام دیتی ہے۔

سویڈن میں ایک ایسا تالا بنایا گیا ہے جس میں کنجی ڈالنے کا سوراخ نہیں ہوتا بلکہ اس کے بجائے مقناطیسی اور میکانی حصوں کے ذریعے اس کو کھولا اور بند کیا جاتا ہے۔ بنانے والوں کا دعویٰ ہے کہ نقب زن اس کو آسانی سے توڑنے یا کھولنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ساتھ ہی ساتھ اس پر پانی کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ یہ دروازوں، صندوقوں اور دیگر عام و خاص مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے اس تالے کی تیاری کا اصل خیال سب سے پہلے سویڈن کے ایک انجینئر کلاس وی ایلینڈ کو آیا تھا۔ پھر اس نے ایک برطانوی ٹیلی مواصلات کے ماہر ارن لوگر کے تعاون سے اُسے تیار کر لیا۔ آج کل کے زیرِ استعمال تالوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ انہیں کھولنے یا بند کرنے کے لئے کنجی لگانی پڑتی ہے جس کے لئے ان میں ایک سوراخ ہوتا ہے اور اس سوراخ کی وجہ سے وہ مرمت طلب بن جاتی ہے۔ اس طرح وہ بآسانی توڑ یا کھولے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ نو ایجاد تالا کنجی کا سوراخ نہ ہونے کی وجہ سے اس خرابی سے مبرا ہے۔

www.taemeernews.com

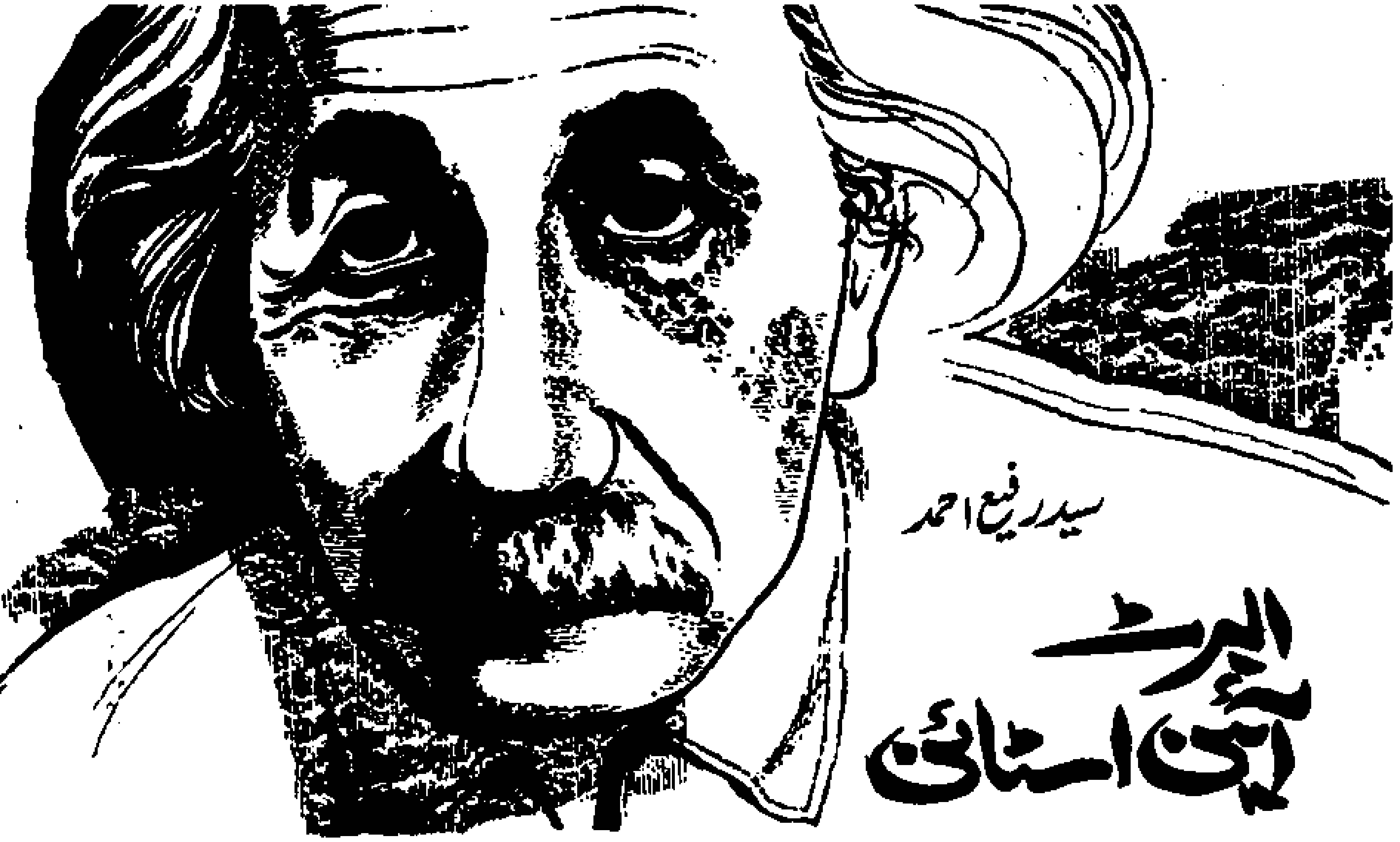

البرٹ آئن اسٹائن

سید رفیع احمد

یہ بات بہت کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگی کہ دورِ حاضر کا سب سے بڑا سائنسداں البرٹ آئن سٹائن نہایت ہی مذہبی شخص تھا۔ وہ مذہبی اس معنے میں نہیں تھا کہ وہ بہت عبادت گزار اور مذہب کے ظاہری رسوم کا پابند تھا بلکہ اس عمیق معنوں میں کہ وہ اس اللہ کا قائل تھا جو اس ساری کائنات کا خالق ہے۔ یہ آئن سٹائن ہی تھا جس نے انیسویں صدی کے مادی عقائد جو نیوٹن (Newton) کے کلاسیکی نظریہ پر مبنی تھا۔ غلط ثابت کر دیا۔ بیسویں صدی کے شروع میں، نیوٹن، ڈارون، مارکس، فرائڈ، ڈالٹن اور ہیگل کے مادی نظریے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ لیکن آئن شٹائن نے اس مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روک دیا اور بے دینی کے سیلاب کو پیچھے ہٹا دیا۔

اس سے پہلے کہ اس کے نظریہ کا جائزہ لیا جائے یہ بہتر ہوگا کہ اس کی زندگی کے مختصر حالات کو بیان کر دیا جائے۔

آئن سٹائن ۱۸۷۹ء کو جنوبی جرمنی میں پیدا ہوا یہ نسلاً یہودی تھا۔ بچپن میں اس میں کوئی غیر معمولی قابلیت نہ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنی تعلیم سوئزرلینڈ میں شروع کی۔ اس کے بعد وہ زیورچ یونیورسٹی میں محکمہ ایجادات میں ملازم ہو گیا۔ ۱۹۵۵ء میں اس نے (THEORY OF RELATIVITY اور QUONTUM THEORY) کا اعلان کیا۔ جس سے اس کو Ph.D کی ڈگری حاصل ہوئی۔ جس کے بعد اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے اور اس کو برلن یونیورسٹی آنے کی دعوت دی گئی۔ جہاں یہ یونیورسٹی کے سینئر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہونے کے علاوہ پرشا اکیڈمی کا رکن بھی مقرر ہوا اس نے جرمنی میں اپنی زندگی کے بیس سال گزارے۔ پھر نازیوں کو جب طاقت حاصل ہوئی اور وہ یہودیوں پر جبر و تشدد کرنے لگے تو یہ امریکہ چلا آیا اور پرنسٹن یونیورسٹی میں زندگی

www.taemeernews.com

بھری پروفیسر شپ قبول کرلی۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں آئین سٹائن نے پریزیڈنٹ روز ویلٹ کی توجہ اٹیم بم کے ایجاد ہوسکنے کی طرف منتقل کی تب ڈاکٹر رابرٹ روپن ہیمر نے آئین سٹائن کی نگرانی میں اٹیم بم تیار کیا۔ اس نے اٹیم بم کے ایجاد ہوسکنے کے امکان پر اس نے زور دیا کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جرمن سائینسداں بڑے زور شور سے تجربے کر رہے ہیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئے تو دنیا ایک بڑی مصیبت میں پھنس جائے گی۔ حقیقتاً وہ نیوکلائی ہتھیاروں اور جنگ و جدل کا سخت دشمن تھا۔

آئین سٹائن اپنے فلسفیانہ نظریہ میں ار کے بہت قریب ہے وہ ایک کائناتی، مذہبی احساس کا قائل ہے۔ اس کے خیال کے مطابق، آرٹس اور سائنس کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ کائناتی مذہب کے احساس کو زندہ رکھے۔

وہ اپنے ایک مضمون "SCIENCE AND RELIGION" میں لکھتا ہے کہ

"Science without religion is lame and religion without science is blind."

یہ دیکھنے کے لئے کہ آئین سٹائن نے کس طرح مادہ پرست اور دہریہ یوروپ میں مذہبی روح کو زندہ کرنے میں بھی مدد دی ہیں نیوٹن کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ نیوٹن کے فلسفہ میں یہ فرض کرلیا گیا تھا۔ مادہ اور قوت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں اور اگر اس نظام کی موجودہ صورت معلوم ہو تو اس کی سابقہ اور آئندہ تمام حالتیں۔ پوری طرح معین کی جاسکتی ہیں پھر سائینسدانوں میں جس میں ڈالٹن کا نام سب سے اوپر ہے یہ فیصلہ کردیا کہ مادہ بہت ہی چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنا ہوا ہے جن کو جوہر یا اٹیم کہتے ہیں جو کہ اجزائے لاتجزی ہونے کی وجہ سے ختم نہیں کئے جاسکتے۔

اس سے مادی فلسفہ کا آغاز ہوا جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں سارے یورپ میں پھیل گیا۔ ان کا سب سے بڑا دعویٰ یہ تھا کہ معلول اور علت میں تعلق لازمی ہے اس لئے یہ کائنات اس خدا کی تخلیق نہیں ہوسکتی جسے غیر مادی خیال کیا جاتا ہے پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر جوہر ازلی اور ابدی ہے تو خدا کی حقیقت ایک معمار یا اچھے انجنیئر کی ہے۔ غرض سائنس والوں نے اس نامکمل تحقیق پر اکتفا کرکے اپنے تمام اصول دہریت اور مادہ پرستی کی بنیاد پر قائم کرلیا لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں سائینسدانوں کی تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا کہ یہ جوہر بھی ٹوٹ سکتے ہیں یہ جوہر برقی لہروں کے مثبت اور منفی بلبلوں کا مجموعہ نکلا یہ جوہر (Neutron اور Proton، Electron) سے بنا ہے جوہر میں ان کی تعداد کے فرق سے الگ الگ عنصر بنتے ہیں سونے اور پارے کے جوہروں میں صرف ایک (Electron) کا فرق ہے اگر پارے میں ایک (Electron) ملا دیا جائے تو وہ سونا بن جاتا ہے ایک جاپانی سائینسداں کو اس میں کامیابی حاصل ہوچکی ہے جوہر کے ذرات (ELECTRON، PROTON اور NEUTRON) برقی لہروں میں تبدیل ہوکر فنا ہوجاتے ہیں اس لئے مادہ ازلی اور ابدی نہیں ہے۔

اب مادیین کا یہ فلسفہ کہ کائنات جو مادی ہے کسی غیر مادی خدا کی تخلیق نہیں ہوسکتی —— لیکن آئین سٹائن نے اس بے بنیاد استدلال کو پارہ پارہ کردیا۔ محض فلسفیانہ دلائل پہ نہیں بلکہ حقیقی مشاہدات اور ریاضی اور سائنسی

www.taemeernews.com

ثبوت پر۔ اس نے نیوٹن کے بنیادی فلسفہ کی تردید کی کہ مادہ اور قوت الگ چیز ہیں اس نے کہا کہ یہ ایک ہی چیز کی دو شکلیں ہیں اور ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ اس نے کہا کہ مادہ اور قوت ایک دوسرے ہی منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ کسی جوہر کو توڑنے سے بے انتہا قوت نکلتی ہے جو نیوکلیر انرجی کی شکل میں انسان کو بے انتہا فائدہ پہنچاتی ہیں اور اٹیم اور ہائیڈروجن بم کی شکل میں سخت تباہی لائی ہے آئن سٹائن نے مادہ اور قوت کے تناسب کو ظاہر کرنے کے لئے ایک فارمولا ($E = mc^2$) دیا جو بعد ازاں تجربہ گاہ میں پرکھا گیا اور بالکل صحیح ثابت ہوا اس سے مادین کا دوسرا فلسفہ بھی اپنی حقیقت کھو بیٹھا۔

چونکہ خدا نور ہے اور مادہ اور قوت بھی نور کی ایک شکل ہے اس لئے بلاشبہ وہ اس کائنات کی تخلیق کر سکتا ہے۔ اس عالم کے پیدائش کی کہانی صرف چھ لفظوں میں بیان کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ (God said : Let there be light .

میں یہ نہیں کہتا کہ آئن سٹائن کے نظریہ سے خدا کے وجود کو ثابت کر دیا لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ذات باری کے بارے میں جو منکرین اور مادین کو جو زور استدلال حاصل تھا وہ ختم ہو گیا اور اس کی تردید ہو گئی اس طرح مذہب کی راہ میں جو سب سے بڑی رکاوٹ تھی وہ دور ہو گئی۔ اب انسانوں کے لئے راستہ صاف ہے۔ کہ وہ ایک خدا کی موجودگی کی طرف مائل ہوں جو اس کائنات کا خالق ہے۔

حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے چار سو اسی سال قبل ایرانی فوجوں نے یونان کو مکمل شکست دیدی تھی اور دارالسلطنت ایتھنس کی طرف بڑھنے لگی تھیں۔ اس وقت پرسی لیس نام کے ایک فوجی افسر نے ذمہ داری لی کہ وہ ایتھنس کو بچائے گا۔ اور ایران کو شکست دیدے گا — مشہور ہے کہ پرسی لیس نے صرف دو ہزار ناتجربہ کار سپاہیوں کی مدد سے ایران کی بیس ہزار فوج کا مقابلہ کیا اور ایران کو شکست دے دی — پرسی لیس کا شمار آج بھی دنیا کے بہترین فوجی جنرلوں میں ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

مولانا شبلی نعمانی

تیس دن کے لئے ترکِ مے و ساقی کرلوں!
واعظِ سادہ کو روزوں میں تو راضی کرلوں!

پھینک دینے کی کوئی چیز نہیں فضل و کمال
ورنہ حاسد تری خاطر سے میں یہ بھی کرلوں

اے نکیرین، قیامت ہی پہ رکھو پرسش
میں ذرا عمرِ گذشتہ کی تلافی کرلوں

کچھ تو ہو چارۂ غم بات تو یک سو ہو جائے
تم خفا ہو تو اجل ہی کو میں راضی کرلوں

اور پھر کس کو پسند آئے گا ویرانۂ دل
غم سے مانا بھی کہ اس گھر کو میں خالی کرلوں

دل ہی ملتا نہیں سفلوں سے و گرنہ شبلی
خوب گزرے فلکِ دُوں سے جو یاری کرلوں

شمس العلما علامہ شبلی نعانی ۱۸۵۷ء میں موضع بندول ضلع آعظم گڑھ کے ایک وکیل شیخ حبیب اللہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ علامہ موصوف کی شخصیت بڑی ہمہ گیر تھی۔ تاریخ و تنقید کے میدان میں وہ ممتاز ترین مقام کے حامل ہیں۔ اُن کے پائے کے نثر نگار برصغیر میں چند ایک ہی پیدا ہوئے۔ انہوں نے اردو ادب میں ایک مکتبۂ فکر کی بنیاد رکھی۔ اُن کی مورخانہ حیثیت بھی بے حد عظیم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ رنگِ سخن کی پختگی اور پاکیزگی اُن کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو علم و ادب کا یہ آفتاب درخشاں غروب ہوگیا۔

اب مصنوعی ستارے موسم کی چوکیداری کرتے ہیں

محمد علی چراغ

دنیا بہت سی قوموں میں بٹی ہوئی ہے ایک ملک کا باشندہ مناسب اجازت نامے کے بغیر دوسرے ملک میں داخل نہیں ہو سکتا۔ لیکن قدرت کا ایک عطیہ ایسا ہے جس میں ہم سب بلا امتیاز ملک و ملت برابر کے شریک ہیں اور وہ ہے زمین کا کرۂ باد۔ ہوا کے بغیر ہم چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ فضائی دباؤ زمین کے کونے کونے تک ہوا کی ضروری مقدار پہنچاتا ہے۔ ملکی حدود اور پابندیاں اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں۔ بارش بھی ہوا کے اس غلاف کا تحفہ ہے۔ اس میں بھی اقوام عالم برابر کی شریک ہیں۔ ابرِ رحمت گورے کالے کی تمیز نہیں کرتا۔

موسمی پیشگوئی کی افادیت محتاجِ بیان نہیں۔ ہماری روزمرہ زندگی بڑی حد تک موسم پر منحصر ہے اگر ہمیں پہلے سے معلوم ہو جائے کہ آئندہ چند روز یا آئندہ ماہ موسم کیسا رہے گا تو ہم اپنے مشاغل اور مصروفیات اسی کے مطابق طے کر سکتے ہیں۔ ہمارے ریڈیو اور اخبار آئندہ چوبیس گھنٹوں کے متعلق پیشگوئی کرتے ہیں، لیکن بڑے منصوبے کے لئے اتنی قلیل مدت پیشگوئی کافی نہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ کم از کم ایک سال تک کے لئے پیش گوئی کر دی جائے۔

www.taemeernews.com

دنیا کی تمام اقوام ایسی طویل پیشگوئیوں میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر قسم کے سیاسی اختلافات کو پس پشت ڈال کر بعض سائنسی پروگراموں میں ایک دوسرے سے تعاون کر رہی ہیں۔ موسمی مشاہدے اور پیش گوئی کا پروگرام ان ہی میں سے ایک ہے اور مقام مسرت ہے کہ دنیا کی بیشتر اقوام اس میں شریک ہیں موسم فضائی بلندیوں کے علاوہ بعض سمندروں، براعظموں اور قطبین میں جنم لیتا ہے، اگر آج انگلستان کسی طوفان کی زد میں ہے تو کل یورپ کے بیشتر ممالک اس سے دوچار ہوں گے اگر ہمارے کسی پڑوسی ملک پر آج کوئی موسمی آفت آئی ہے تو کل ہمارے اس مصیبت میں مبتلا ہو جانے کا بھی قوی امکان ہے۔

موسم کو سمجھنے اور اس کی سختیوں سے قبل از وقت باخبر ہو جانے کے لئے سائنس دانوں نے حال ہی میں بعض نہایت عمدہ آلات ایجاد کئے ہیں۔ دنیا کی تمام اقوام موسمی تحقیقات اور پیش گوئیوں سے تقریباً ایک صدی کے طویل عرصہ سے یکساں طور پر مستفید ہو رہی ہیں۔ اقوام متحدہ کی ایک خصوصی ایجنسی یہ فرض ادا کرتی ہے اس کا نام "ورلڈ میٹرولوجیکل آرگنائزیشن" ہے ایک سو چھیں اقوام اس کی رکن ہیں۔

ہر ملک اپنی اپنی بساط اور وسائل کے مطابق موسمی اطلاعات فراہم کرتا ہے اور پھر دوسرے ممالک کے ساتھ ان کا تبادلہ کرتا ہے۔ بحری، بری اور ہوائی ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل کا انحصار بہت کچھ ان معلومات اور پیشگوئیوں پر ہے عالمی ہوائی سروسیں صرف اپنے ملک کی فراہم کردہ موسمی پیشگوئی پر اکتفا نہیں کر سکتیں انہیں دوسرے ممالک کی امداد اور تعاون کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ اس لحاظ سے اس ایجنسی کا قیام اور عمل لائق ستائش ہے۔

اب شمالی بحر اٹلانٹک اور دنیا کے دوسرے سمندروں

www.taemeernews.com

دور افتادہ جزیروں برف کے بہتے ہوئے تودوں اور بحر منجمد جنوبی تک پر موسمی رصدگاہیں قائم کردی گئی ہیں جہاں انسانی خدمت کے جذبہ سے سرشار نہایت منکسر مزاج اور قانع سائنسداں موسمی سختیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے دنیا بھر کے انسانوں کے لئے مفید موسمی معلومات مہیا کرتے ہیں۔

ہماری زمین کے ۳/۴ حصہ پر سمندر چھائے ہوئے ہیں موسم وہاں بھی تغیر پذیر رہتا ہے، بحری طوفان جہاز رانی کے لئے ہمیشہ سے زبردست خطرہ بنے ہوئے ہیں، سمندروں پر موسمی رصدگاہیں قائم کرنا جدید سائنس کا کمال ہے، بحرالکاہل اپنے نام کا خیال نہیں رکھتا اور مغربی امریکہ کے موسم پر براہ راست اثرانداز ہوتا ہے اس قسم کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے سمندروں پر زیادہ سے زیادہ رصدگاہیں اور موسمی چوکیاں قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

سائنس کی مختلف شاخوں نے حالیہ چند برسوں میں جو غیر معمولی ترقی کی ہے اس کا اثر موسمیات کی سائنس پر بھی پڑا ہے جدید آلات سے اس نے بھی فائدہ اٹھایا ہے خلائی تجربات و تحقیقات اور خودکار آلات نے بیش قیمت معلومات فراہم کی ہیں مصنوعی سیاروں نے پوری زمین کا احاطہ کرلیا ہے ان سے موسمی معلومات حاصل کی جارہی ہیں، آنے والے طوفانوں کو راڈر کے پردے پر بہت پہلے دیکھ لیا جاتا ہے اور ان سے بچنے کی تدبیر کی جاتی ہے، موسمی معلومات کو یکجا کرنے اور ان سے اہم نتائج اخذ کرنے کا کام جدید تیز رفتار کمپیوٹر کر رہے ہیں، جدید مواصلاتی نظام ان معلومات کو آن کی آن میں دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیتا ہے اور بہت سے حادثات کا سدباب کردیا جاتا ہے۔

سائنس داں ان معلومات سے فضائے بسیط کے ریاضیاتی ماڈل تیار کرتے ہیں ان ماڈلوں سے آنے والے موسم کا اندازہ وقت سے بہت پہلے لگا لیا جاتا ہے، ہوا کے بالائی طبقات اور ان کی نقل و حرکت کو سمجھنے میں یہ ماڈل بہت مدد دے رہے ہیں اب سائنس دانوں کو قوی امید ہے کہ وہ آنے والے موسم کے متعلق اگر ایک ماہ قبل نہیں تو کم از کم دو ہفتے قبل یقینی طور پر صحیح پیش گوئی کرسکیں گے اور وہ بھی عالمی پیمانہ پر بلاشبہ یہ سائنس کا ایک اور کمال ہوگا لیکن یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب سائنس دانوں کو زمین سے ایک لاکھ فٹ کی بلندی تک عالمی پیمانہ پر ہواؤں کی رفتار اور سمت درجہ حرارت اور رطوبت وغیرہ کے متعلق مکمل معلومات حاصل ہوجائیں۔

اس ضرورت کے پیش نظر موسمیاتی سیارے چھوڑے گئے ان کے پیشرو وہ غبارے تھے جو سیکڑوں کی تعداد میں وقتاً فوقتاً چھوڑے جاتے رہے ہیں، خودکار کیمرے اور دوسرے سائنسی آلات ان میں رکھے ہوتے تھے اور وہ فضا کے مختلف طبقات کے متعلق تمام سائنسی معلومات ریکارڈ کرتے تھے جب پیراشوٹ کے ذریعہ آلات زمین پر واپس آتے تھے تو سائنس دانوں کو ان سے موسمی معلومات حاصل ہوجاتی تھیں جو پیشگوئیوں میں مدد دیتی تھیں، سیاروں کے باوجود غباروں کا استعمال ہنوز جاری ہے، موسمیاتی سائنس کو کامیاب بنانے میں انہوں نے بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

موسمی معلومات فراہم کرنے کے لئے سب سے پہلے ۱۹۶۱ء میں دس نامی مصنوعی سیارے چھوڑے گئے آنے والے طوفان کا اندازہ لگانے کے لئے جگہ جگہ راڈر سیٹ لگائے گئے ابھی طوفان دور ہوتا ہے کہ راڈر کے پردے پر اس کی تصویر ابھر آتی ہے اور لوگوں کو خبردار کردیا جاتا ہے مشرقی پاکستان کے ساحل پر موسمی چوکیاں قائم ہیں اور راڈر سیٹ لگے ہوئے ہیں خطرے کے وقت سگنل بلند کئے جاتے ہیں اور آس پاس تمام باشندوں کو مطلع کردیا جاتا ہے کہ وہ خطرے سے آگاہ ہوجائیں

www.taemeernews.com

اور اس کا سد باب کریں۔

اگرچہ ہم محسوس نہیں کرتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ بادل ہمارے موسم میں دخل رکھتے ہیں۔ دنیا کے کسی نہ کسی حصے پر بادل موجود ہوتے ہیں۔ خط استوا کے علاقوں میں سارے سال بارش ہوتی ہے، طوفان باد و باراں سے اگر اس وقت آپ محفوظ ہیں تو دنیا کا کوئی دوسرا ملک اس میں گرفتار ہوگا، بجلی اگر آپ کے ملک میں نہیں چمک رہی ہے تو کہیں اور چمک رہی ہوگی بلکہ گر رہی ہوگی، زمین پر بیٹھے بیٹھے بادلوں پر نظر نہیں رکھی جاسکتی اس لئے موسمی سیاروں سے مدد لی گئی، وہ زمین سے بلند ہو کر بادلوں کو اچھی طرح "دیکھ" سکتے ہیں اور وائرلیس کے ذریعہ ان کی بناوٹ، حرکت ارتکاز اور دوسری باتوں کی اطلاع آپ کو دے سکتے ہیں، ان کے خودکار کیمروں نے بادلوں کی بڑی اچھی تصاویر زمین تک بھیجی ہیں، زمین پر ایسے آلات لگے ہوتے ہیں، جو ساتھ ساتھ ان تمام معلومات اور تصاویر کا تجزیہ کرتے جاتے ہیں۔ اور ان سے موسمی پیشگوئیاں تیار کرتے رہتے ہیں۔

ان مقاصد کے پیش نظر واشنگٹن، ماسکو اور ملبورن میں عالمی موسم پر نظر رکھنے کے لئے مرکز مقرر کئے گئے ہیں، دنیا کے تمام ممالک ان کی خدمات سے استفادہ کرسکتے ہیں اور صنعت و حرفت، زراعت، ہوابازی اور عوامی شعبوں میں ان کی فراہم کردہ موسمی پیشگوئیاں استعمال کرسکتے ہیں۔

عالمی موسم پر نظر رکھنے کے لئے "ورلڈ ویدر واچ" کے نام سے ایک تنظیم بھی وجود میں آئی ہے۔ اس کی ذمہ داریوں میں یہ کام بھی شامل ہے کہ دنیا کے تمام براعظموں کو مواصلات کے ایک عالمگیر نظام میں مربوط کرے اور قبل از وقت موسمی پیش گوئیاں بہم پہنچائے۔ اس سلسلے میں سیارے غیر معمولی افادیت کے حامل پائے گئے ہیں۔ اس لئے انہیں رواج دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اگرچہ سیارے زمین سے مناسب بلندی پر چھوڑے جائیں تو وہ گرداں اور متحرک ہونے کے باوجود ایک جگہ ٹھیرے ہوئے نظر آئیں گے، ایسے چند سیارے ساری زمین کا احاطہ کرسکتے ہیں، اور پورے عالمی موسم پر نظر رکھ سکتے ہیں، یہ سیارے غباروں، سمندروں میں تیرتی ہوئی ننھی رصدگاہیں اور دیگر موسمی چوکیوں سے بھی معلومات حاصل کرسکتے ہیں۔ ایسے آلات بنائے جاچکے ہیں جو فضا کے مختلف طبقات کا درجۂ حرارت، انجذاب کی مقدار، بادلوں کی بناوٹ سطح ارض کا ٹمپریچر، ہواؤں کا رخ اور ان کی شدت، برف بننے کی ابتدا اور ان تمام عوامل پر نظر رکھ سکتے ہیں، جو موسمیات سے تعلق رکھتے ہیں۔

انڈونیشیا کے قریب سماترا نامی جزیرے میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے۔ جو پانی برساتا ہے یہاں کے باشندے اسے بارش والا درخت کہتے ہیں۔ دوپہر کو جس وقت سورج کی شعاعیں زمین پر بالکل سیدھی پڑتی ہیں۔ اس وقت یہ درخت اپنے اندر بھاپ جذب کر لیتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد یہ بھاپ جمع ہو کر پانی کی شکل میں برسنے لگتی ہے۔ اگر پیڑ کے نیچے ایک گھڑا رکھ دیا جائے تو وہ بڑی آسانی سے تھوڑی ہی دیر میں بھر جاتا ہے۔ اسی سے ملتا جلتا ایک اور درخت افریقہ کے جنگلات میں پایا جاتا ہے۔ جس کے تنے میں سوراخ کر دینے سے صاف اور ٹھنڈا پانی نکلنے لگتا ہے۔

www.taemeernews.com

جب تیل میں آگ لگ جاتی ہے

محمد شاہد

زیادہ دن نہیں ہوئے ایران کے تیل کے شہر عواض میں تاریخ کا سب سے بھیانک آتشزدگی کا واقعہ پیش آیا۔ اپریل ۱۹۶۳ء میں جبکہ جیالوجی کے ماہرین تیل کی تلاش میں ایک کنوئیں کی کھدائی کر رہے تھے کہ غیر متوقع طور پر قدرتی گیس پھٹنے سے زیر زمین ایک زبردست دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ اتنا شدید تھا کہ چھ سو ٹن ڈرلنگ کا سامان زلزلے کے ساتھ فضا میں اڑا اور معمولی تنکوں کی طرح بکھر گیا۔ ایک اندازہ کے مطابق دھماکہ کا دباؤ آٹھ ہزار پونڈ سے بھی زیادہ تھا۔ طہران سے ۴۰۰ میل دور اس ریگستانی علاقہ میں گذشتہ تیس برس سے تیل کو تلاش کی جا رہا تھا۔

تیل کے کنوئیں میں اچانک بھڑک اٹھنے والی آگ بڑی مہیب ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا رقبہ جہنم زار بن جاتا ہے چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے کام میں لگے ہوئے مزدور آگ کے مہیب شعلوں کی لپیٹ میں آگئے جنہیں بچایا نہیں جا سکا آگ کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لئے احتیاطی تدابیر کے طور پر کنوئیں کے اطراف خندق بنانے کے لئے فوج کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ یہ آگ اس قدر مہیب تھی کہ اس کے شعلے چھ سو فٹ بلند ہو رہے تھے جو ایک سو میل کی دوری سے دیکھے جا سکتے تھے۔ آگ بجھانے کی جتنی بھی کوشش کی جاتی وہ اسی قدر بڑھتی جا رہی تھی۔ آگ بجھانے کے لئے بین الاقوامی شہرت یافتہ فائر فائٹر میرن کنلے کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ساڑھے سات ہزار میل کی مسافت طے کر کے میرن کنلے امریکہ سے عواض پہنچے تو چوتھا دن گزر چکا تھا۔ تاہم آگ کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ آگ بجھانے کے لئے کافی مقدار میں پانی کی شدید ضرورت تھی۔ اس تپتے ہوئے ریگستانی علاقہ میں پانی کہاں عواض سے قریب ترین خرم ندی ۲۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے چنانچہ سب سے پہلے ۲۵ میل طویل پائپ لائن بچھائی پڑی۔ نئی تعمیر شدہ پائپ لائن کے ذریعہ جب عواض میں پانی آنے لگا تب میرن کنلے نے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ تیسرا دن

www.taemeernews.com

کے وقت تپتے ہوئے سورج کی تمازت کے باعث آگ بجھانے کا کام نہایت دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے صرف رات کے وقت آگ بجھائی جا سکتی ہے۔ نصف رات سے صبح سورج نکلنے تک۔ ساٹھ فٹ بلند کرینوں کی مدد سے کنوئیں کے اطراف جلے ہوئے ملبہ کو ٹھنڈا کرنے کے لئے متواتر پانی کا چھڑکاؤ کیا گیا۔ یہ کرین بل ڈوزرس پر فٹ کئے گئے تھے اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی آگ کی حدت سے محفوظ رکھنے کی خاطر ان پر اسبسٹاس شیٹیں چڑھا دیئے گئے تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ڈوزرس پر پانی کے چھڑکاؤ کا ایسا زبردست بندوبست کیا گیا تھا کہ بغیر کسی رکاوٹ کے متواتر پانی گرتا رہے پھر بل ڈوزرس کے ذریعہ آگ کے شعلوں میں گھرے ہوئے کنوئیں کے اطراف سے ملبہ کو تیزی سے ہٹایا جانے لگا۔

تیل کے کنوؤں میں لگنے والی آگ کو بجھانے کے لئے کنلے جو تکنک استعمال کرتے ہیں وہ ایک سیدھے سادے اصول کے مطابق ہے یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ آگ آکسیجن کے بغیر فوراً بجھ جاتی ہے۔ اگر کسی طرح شعلوں اور جلتی ہوئی گیس کے درمیان مصنوعی خلا پیدا کر دیا جائے تو آگ رفتہ رفتہ بجھ جاتی ہے۔ یہی وہ خاص تکنک ہے جس کے میرن کنلے ماہر ہیں۔ اس طریقہ کو میرن کنلے کے والد بزرگوار کارل کنلے نے دریافت کیا تھا ۱۹۱۳ء میں جبکہ کارل ٹی کنلے سانتافی اسپرنگ کیلیفورنیا میں جہاں ایک تیل کے کنوئیں میں آگ لگ گئی تھی۔ آگ پر قابو پانے کی جان توڑ کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ سامان میں رکھا ہوا ڈائنامیٹ نہ جانے کس طرح اچانک پھٹ پڑا۔ ڈائنامیٹ کے پھٹنے سے ایک زبردست شعلہ پیدا ہوا۔ اس اچانک حادثہ کے نتیجہ میں آگ آناً فاناً بجھ گئی کیونکہ شعلوں کے ذریعہ تیل کو پہنچنے والی آکسیجن کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ چنانچہ میرن کنلے اس طریق کار کو استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح سانپ کے کاٹے کا تریاق سانپ کا زہر ہوتا ہے۔ اسی طرح آگ کو بجھانے کے لئے آگ سے مدد لی جاتی ہے۔ جلتے ہوئے کنوئیں میں ڈائنامیٹ لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی نیوز میں جلتے ہی کان پھاڑ دینے والی آواز سنائی دی اور روشنی کا ایک زبردست جھماکا ہوا پان امریکن ایرلائینز کا ایک مسافر بردار طیارہ کے ہوا باز نے جو اس وقت کئی میل دور پرواز کر رہا تھا بعد میں بتایا کہ اسے ایسا محسوس ہوا گویا کہیں بجلی کوندی

www.taemeernews.com

ہے۔ جھاکے کے ساتھ ہی آگ کے مہیب شعلے ماند ہوگئے وہ آگ جو تقریباً چھ ہفتوں، وسط اپریل سے مئی کے اختتام تک برابر جلتی رہی اب بجھ گئی تھی۔

میرن کنلے نے اپنے لئے جو پیشہ منتخب کیا ہے وہ لاکھ ایڈونچرس سہی لیکن پُرخطر ہے۔ آتشزدگی کی نوعیت عموماً مختلف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ہر مرتبہ ایک نئے چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اندازہ کی معمولی سی غلطی بھی کسی بدترین حادثہ کا سبب بن سکتی ہے۔ میرن کنلے کے خاندان کے بیشتر افراد تیل کے کنوؤں میں آئیل مین کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں۔ خود میرن کنلے کے والد بزرگوار اپنے وقت کے مشہور فائر فائٹر تھے پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد میرن کنلے کے اپنے چھوٹے بھائی فلائیڈ کنلے کے ساتھ اپنے خاندانی کاروبار کا آغاز کیا۔ مستعدی اور ذہانت کے باعث ان کا کاروبار تھوڑے ہی عرصہ میں چمک اٹھا۔ بدقسمتی سے ۱۹۳۸ء میں جب کہ دونوں بھائی آگ بجھانے میں لگے ہوتے تھے فلائیڈ کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور وہ اس حادثہ سے جانبر نہ ہوسکا

آگ ایران کے کسی تیل کے کنوئیں میں لگے یا جنوبی امریکہ میں میرن کنلے کی خدمات لازمی سمجھی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں سارے امریکہ میں سمندر (ایک کیڑا جو ہمیشہ آگ میں رہتا ہے) (SLAMENDER) کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے بعض بے تکلف دوست انہیں "آگ کا بھوت" کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔ میرن کنلے لگ بھگ ۳۵ برس سے اس خطرناک کاروبار سے منسلک ہیں۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق کنلے کی سالانہ آمدنی دس لاکھ پچاس ہزار روپے سے زائد ہے۔ میرن کنلے کی زندگی حادثات سے بھری پڑی ہیں۔ انہیں متعدد مرتبہ ناقابل یقین حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ جو کٹھن بھی تھے صبر آزما بھی۔ لیکن انہوں نے کبھی بھی امید کا دامن نہیں چھوڑا اور بلاشبہ ان آدمیوں میں شمار کئے جاتے ہیں جنہوں نے کبھی ناکامی کی شکل نہیں دیکھی۔

۱۹۳۱ء میں گلیڈ واٹر ٹکساس میں ایک تیل کا کنواں جو برسوں سے خشک پڑا ہوا تھا اچانک ابل پڑا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے۔ اس میں آگ لگ گئی۔ اس موقع پر میرن کنلے کو فوری مدد کے لئے بلایا گیا۔ میرن کنلے جس وقت کنوئیں میں دھماکو آمیزہ نیچے اتار رہے تھے، دھاتی پائپ کا ایک ٹکڑا ان کے پیر میں لگ گیا۔ اس چوٹ سے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اور وہ اس صدمے سے بے ہوش ہوگئے۔ جس وقت میرن کنلے کو امبولینس کار میں اسپتال لے جایا جارہا تھا سارے کارکنوں کے چہروں پر مایوسی جھلک رہی تھی اور ان کے حوصلے پست ہوگئے تھے۔ اسپتال میں میرن کنلے کے پیر پر پلاسٹر چڑھا دیا گیا اور انہیں ہلنے جلنے کی ممانعت تک کردی گئی۔ لیکن ہوش میں آنے پر کنلے نے ڈاکٹروں سے التجا کی کہ انہیں فوراً دوبارہ فیلڈ پر پہنچادیا جائے میرن کنلے کے اٹل فیصلے اور بار بار اصرار پر ڈاکٹروں کو بادل نخواستہ اجازت دینی پڑی۔ چنانچہ چند گھنٹوں بعد ہی میرن کنلے دوبارہ فیلڈ پر پہنچ گئے۔ میرن کنلے کی غیر متوقع واپسی نے سارے کارکنوں میں نئی روح پھونک دی اور وہ نئے جوش وخروش سے اپنے کام پر ٹوٹ پڑے۔ میرن کنلے کی نگرانی میں بالآخر آگ بجھادی گئی۔

۱۹۳۲ء میں میرن کنلے کو موریني (رومانیہ) جانا پڑا جو تیل کی فراوانی کے باعث خاص شہرت رکھتا ہے موریني کے ایک پانچ ہزار فٹ گہرے تیل کے کنوئیں میں آگ لگ گئی تھی جو ۲۵۰ فٹ کے رقبہ میں محیط تھی۔ کنوئیں سے جو

www.taemeernews.com

شعلے بلند ہورہے تھے وہ (۹۵) فٹ بلند تھے۔ یہ کنواں گذشتہ اٹھارہ مہینوں سے جہنم کا نظارہ پیش کر رہا تھا۔ آگ پر قابو پانے کی تمام کوششیں بے سود ہو چکی تھیں۔

میرن کنلے کو اس آگ پر قابو پانے کے لئے زبردست جدوجہد کرنی پڑی۔ تقریباً چھ مہینوں کے بعد آگ پر قابو پایا جاسکا

مشرق وسطیٰ میں عواض کے حادثہ سے قبل ۱۹۵۱ء میں نفت سفید (NAFT SAFID) میں واقع تیل کے ایک کنویں میں آگ لگ گئی تھی۔ اس زمانہ میں اینگلو ایرانین آئیل کمپنی (ANGLO IRANIAN OIL CO.) کے ماہرین کو ایران سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ نفت سفید میں زبردست تباہی مچی ہوئی تھی۔ ایک انگریز صحافی نے جس نے مقام حادثہ کا فضائی معائنہ کیا تھا اس نے اپنی رپورٹ میں جو گارجین میں چھپی تھی۔ متاثرہ علاقہ کی ان الفاظ میں تصویر کھینچی تھی" اونچی اونچی پہاڑیوں سے گھری وادی اس وقت کسی کیتلی میں ابلتی ہوئی چائے کا سا منظر پیش کر رہی ہے۔ آگ کی ہولناکی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ مقامی درجہ حرارت بڑھ کر دو سو پچاس ڈگری ہو گیا تھا۔ دور دور تک جھاڑیاں جھلس گئیں تھیں اور پرندے دور دراز مقامات پر پرواز کر گئے تھے ماہرین کے ایک اندازہ کے مطابق روزانہ تقریباً پانچ ہزار بیرل تیل جل رہا تھا۔ میرن کنلے نے جس تندہی اور جانفشانی سے آگ بجھائی اس کی شاہ ایران اور ایرانی صحافت نے زبردست ستائش کی اور ان کی خدمات کو سراہا۔

کلہون (ٹکساس) میں ۱۹۵۰ء میں میرن کنلے کو جو حادثہ پیش آیا وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے منفرد تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے میرن کنلے کے کردار کی بلندی اور عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ کلہون کے ایک تیل کے کنویں میں آگ لگ گئی تھی۔ اس موقع پر ایک امریکی کمپنی کے تیار کردہ خصوصی خود حفاظتی لباس کی آزمائش بھی کی جانے والی تھی۔ اس موقع پر میرن کنلے اتفاقیہ طور پر موجود تھے۔ آگ بجھانے کے لئے جس شخص کی خدمات حاصل کی گئیں تھیں۔ اسے اپنے کام میں خاصی مہارت تھی لیکن جس وقت وہ نائیٹرو گلیسرین کے ٹن لے کر آہستہ آہستہ کنویں کی طرف بڑھ رہا تھا وہ لڑکھڑا گیا۔ اس وقت معجزہ کے طور پر کنلے اگر اس کے قریب پہنچ کر سے بچا نہ لیتے تو اس کی موت یقینی تھی۔ کنلے کی مستعدی کی وجہ سے ایک قیمتی جان بچ گئی اور ایک زبردست حادثہ ٹل گیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میرن کنلے نے بعد میں اس کام کو پورا کیا پیشہ وارانہ رقابت کے اس دور میں ایسی مثالیں شاید ہی مل سکتی ہیں۔

میرن کنلے سے جب یہ سوال کیا گیا کہ وہ اس خطرناک پیشہ کو ترک کیوں نہیں کر دیتے جب کہ وہ معاشی طور پر آسودہ ہیں اور انہیں مزید روپیہ کمانے کی ہوس بھی نہیں اس پر کنلے نے مسکرا کر کہا ہو سکتا ہے کہ کبھی آگ بجھاتے بجھاتے میں آگ کی لپیٹ میں آجاؤں۔ میرا جسم جھلس جائے یا پھر ڈائنامیٹ کا فیتہ جلاتے ہوئے میرے جسم کے پرخچے اڑجائیں۔ وہ میرا آخری دن ہوگا۔ اس کے بعد میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس پیشہ کو چھوڑ دوں گا ★

ایک چور کسی گھر کا تالا توڑ رہا تھا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مالک مکان دیکھ رہا تھا۔ چور بڑا گھبرایا لیکن مالک مکان نے اسے تسلی دی اور کہا گھبراؤ مت، جاؤ! میں تمہارا شکرگزار ہوں کیونکہ اس تالے کی چابی کھو گئی تھی۔

www.taemeernews.com

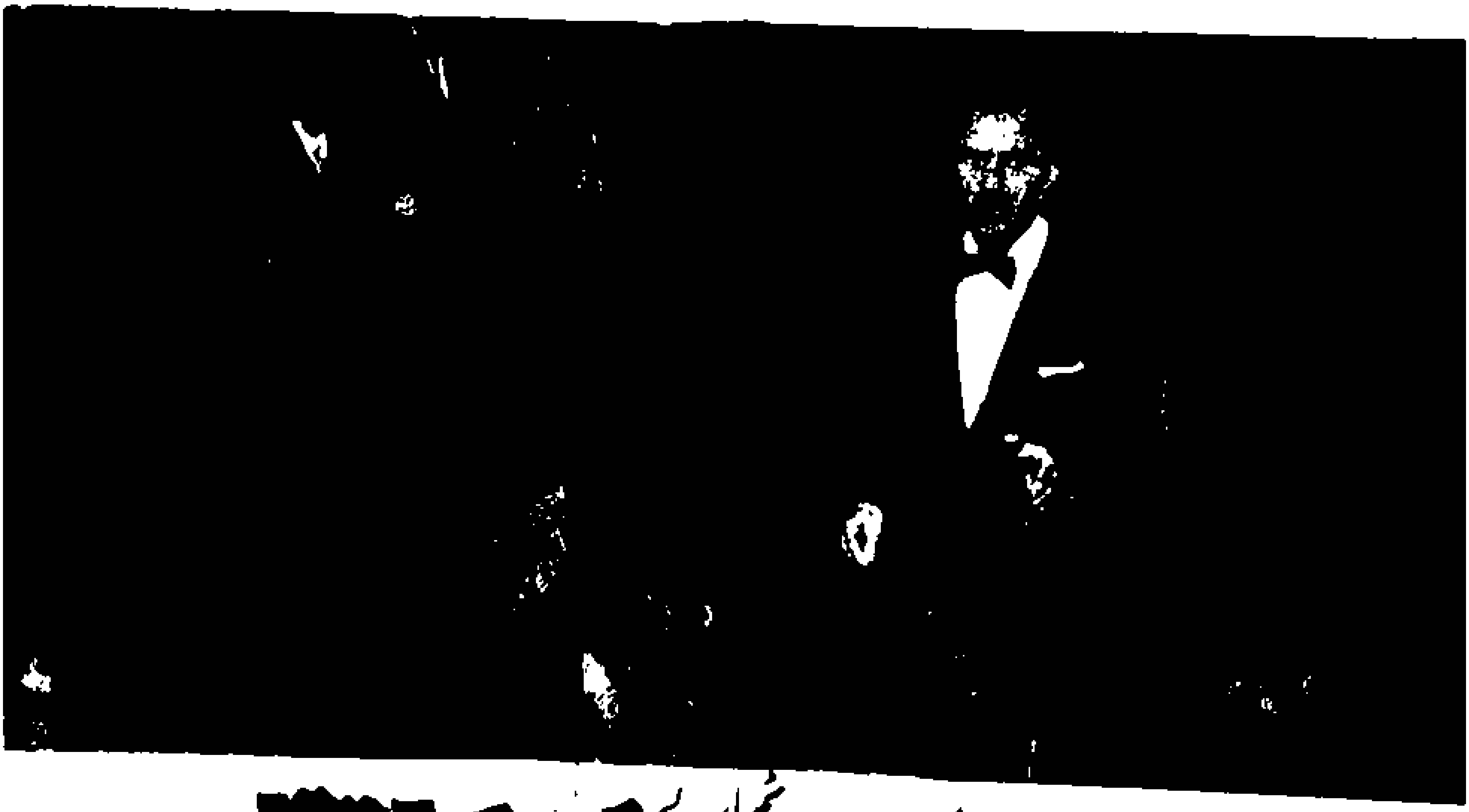

تم ہارے

عیاشی کے لئے ماں باپ کا قتل

یہ ۲۱ اگست ۱۹۵۳ء کی شام کا ذکر ہے۔ نیویارک کا ایک نوجوان جو اپنے والدین سے الگ اور دور رہتا تھا۔ اپنے ایک دوست کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ جب وہ اپنے والدین کے گھر کے قریب سے گزرنے لگا تو اس نے اپنے دوست سے کہا" یار دو منٹ ٹھہرو۔ میں ذرا ڈیڈی اور ممی کو دیکھ لوں
جب وہ اپنے مکان میں داخل ہوا تو اس نے ایک روح فرسا منظر دیکھا۔ اس کا باپ اور ماں دونوں مردہ پڑے تھے۔ نوجوان کے مونہہ سے چیخ نکلی۔ جسے سن کر اس کا دوست بھی اندر آگیا۔ اور اس نے صورتِ حال سے باخبر ہوتے ہی پولیس کو اطلاع دے دی۔ چند منٹ بعد پولیس حکام ایک ڈاکٹر کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے۔

ڈاکٹر نے جھک کر دونوں لاشوں کا جائزہ لیا۔ کسی کے جسم پر کوئی زخم نہیں تھا۔ لیکن دونوں کے لب سرخ تھے اور کچھ کچھ جلے ہوئے تھے۔ پولیس افسر نے ڈاکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا" زہر" ؟ ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا" ہاں! میرا خیال بھی یہی ہے"۔

ساتھ والے کمرے میں میز پر دو گلاس پڑے تھے جن کی تہوں میں سرخی مائل مواد موجود تھا۔ ڈاکٹر نے ایک گلاس کو رومال سے پکڑ کر اٹھایا اور اسے سونگھ کر کہا" زہر سامہ نیڈ"۔ ان کی موت زہر آمیز شراب پینے سے واقع ہوئی ہے۔

ایک پولیس افسر نے کہا" ممکن ہے دونوں نے مل کر خودکشی کی ہو"۔ ڈاکٹر نے کہا" ضروری نہیں۔ لیکن ممکن بھی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر دونوں نے خودکشی کی ہوتی تو گلاس اسی کمرے میں ہوتے جہاں ان کی لاشیں پڑی ہیں اور غالباً جہاں بیٹھ کر انہوں نے شراب پی۔ یہ زہر بہت تیز ہے۔ اسے پینے کے بعد کوئی شخص چند قدم بھی نہیں چل سکتا۔ اس لئے ممکن ہے زہر آمیز شراب ان کو پلائی گئی ہو"۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق ان دونوں کی موت ۴۸ گھنٹے پہلے واقع ہوئی تھی۔

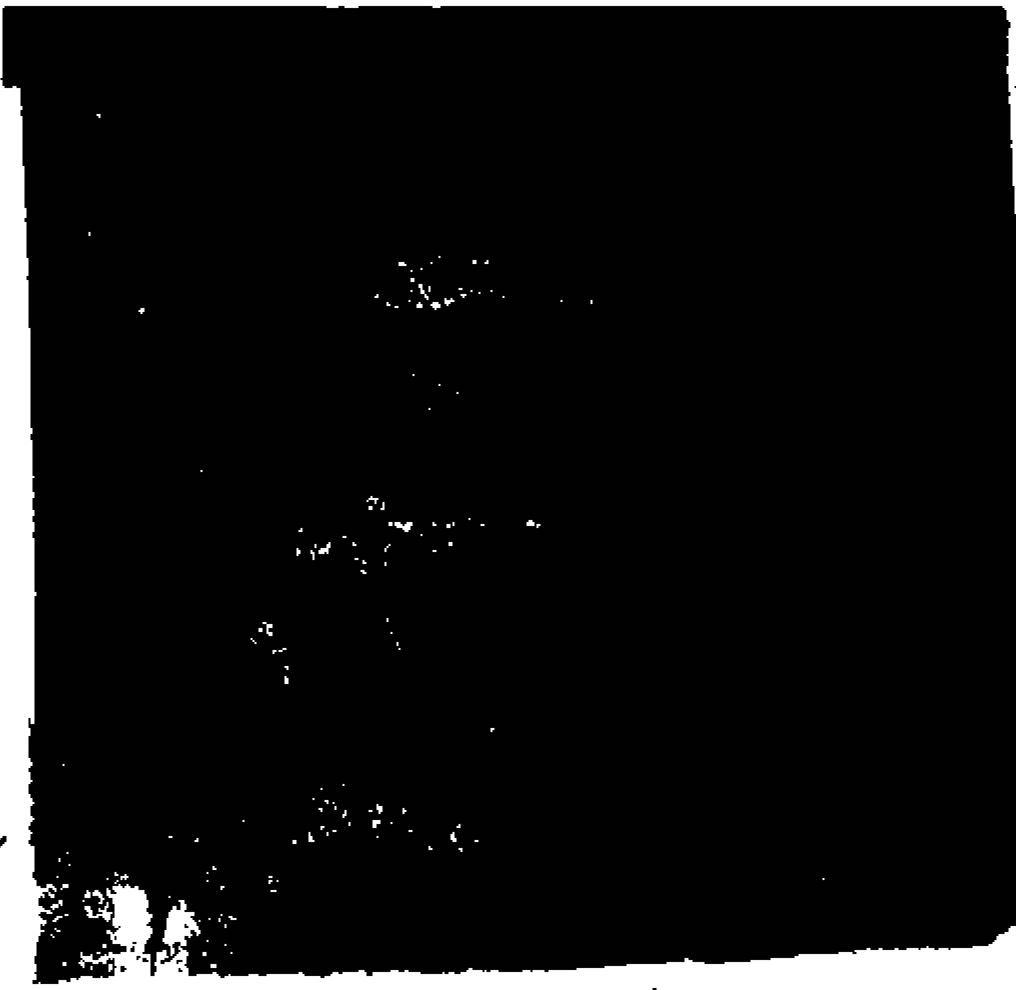

پولیس افسروں نے مرنے والوں کے نوجوان بیٹے سے گفتگو کی تو اس نے بتایا: "میں نے کل ممی کو فون کیا لیکن کسی نے ٹیلیفون نہ اٹھایا۔ آج پھر میں نے دوبارہ ٹیلیفون کیا ـــــ لیکن پھر وہی ہوا کسی نے ریسیور نہیں اٹھایا۔ آج شام میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ادھر سے گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا خود جاکر دیکھوں کہ کیا معاملہ ہے جب میں مکان میں داخل ہوا تو ڈیڈی اور ممی کو اس حالت میں پایا۔"

ایک پولیس افسر نے پوچھا: "کیا یہ ممکن ہے کہ تمہارے ڈیڈی اور ممی نے خودکشی کرلی ہو؟" اس نے جواب دیا۔ "عین ممکن ہے لیکن اگر انہوں نے ایسا کیا تو یہ ناقابل فہم ہے۔"

س: کیا ان کی صحت ٹھیک تھی؟

ج: ہاں! بہت اچھی تھی۔

س: ان کی مالی حالت کیسی تھی؟

ج: وہ خاصے امیر تھے۔ میرا باپ اب بھی سالانہ دو ہزار ڈالر کماتا تھا۔

س: کیا تمہارے باپ اور ماں کے تعلقات ٹھیک تھے؟

ج: (ذرا رک کر) ممی کو کبھی کبھی اعصاب کی کمزوری کی شکایت لاحق ہوتی تھی اور اس کا موڈ خراب ہو جاتا تھا تاہم ان میں ناچاقی پیدا نہیں ہوتی تھی۔ میرا باپ بڑا اچھا اور وفادار شوہر تھا۔ ماں بہت اچھی گرہستن تھی وہ گھر بار کا بہت خیال رکھتی تھی۔"

س: کیا تمہیں کسی آدمی پر شبہ ہے؟ یعنی کیا تمہارے علم میں یہ بات ہے کہ کوئی شخص تمہارے ماں باپ کو نقصان پہنچانے کے درپے تھا؟

ج: میرا خیال ہے نہیں۔ سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔

یہ نوجوان جس کا نام ہارلو تھا اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اس نے ایک سال پہلے اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اب بیکار تھا اور ایک ہوٹل میں رہتا تھا۔

پولیس افسر تمام رات اس مکان میں موجود رہے اور ان کی موت کا معمہ حل کرنے میں مصروف رہے۔ لیکن انہیں ایسا کوئی سراغ نہ ملا جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ انہوں نے خودکشی کی ہے یا ان کو قتل کیا گیا ہے۔ گھر سے کوئی وصیت نامہ بھی نہ ملا جس کا مطلب یہ تھا کہ مرنے والوں کی ساری دولت ان کے لڑکے کو ملے گی۔

پولیس حکام ابھی کسی واضح نتیجہ پر نہیں پہنچے تھے کہ دوسرے علاقے کے سرکاری وکیل نے ان کو فون پر بتایا صرف ۱۳ دن پہلے ہارلو کی خالہ اور خالو اپنے گرمائی مکان میں مردہ پائے گئے تھے۔

خیال تھا کہ گیس پائپ میں خرابی واقع ہونے اور گیس کے خوابگاہ میں داخل ہونے سے ان کی موت واقع ہوئی ہے اب ماں باپ کی موت کی خبر ملی ہے۔ میرا خیال ہے کہ محض اتفاق نہیں ہے اور اس کی خالہ اور خالو کی لاشوں کا ازسرنو معائنہ کرا کے یہ دیکھنا چاہئے کہ کہیں دونوں بہنوں

www.taemeernews.com

اور انکے شوہروں کی موت میں کوئی تعلق تو نہیں ہے۔

پولیس نے اس کمرے کی تلاشی لی۔ جس میں ہارلو ٹھیرا ہوا تھا اس میں سے تھوڑا سا سائنیفائڈ زہر ملا۔ جب اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے کالج میں کیمسٹری کا مضمون لیا تھا اور اب میں کیمسٹ بننا چاہتا ہوں۔ اس لئے میرے پاس کیمیاوی چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

چند دن یوں ہی گزر گئے۔ پولیس کی تفتیش سے معلوم ہو گیا کہ ان میاں بیوی کی موت سے پہلے ہارلو کا اپنے باپ سے جھگڑا ہوا تھا اور اس نے اپنے بعض دوستوں سے اس جھگڑے کا ذکر کیا تھا اور اب ماں باپ کی موت کے بعد اسے ایک لاکھ ڈالر کا ترکہ ملنا تھا۔ پولیس نے دو قابل سراغ رساں ہارلو کے ماں باپ کی موت کا معمہ حل کرنے پر مامور کر دیئے اور بظاہر تفتیش ختم کر دی۔

سراغرسانوں نے چند ہی روز کے اندر جو معلومات حاصل کیں وہ یہ تھیں:

ہارلو اپنے دوست لڑکوں کو بتایا کرتا تھا کہ اسے اپنی ماں سے نفرت ہے کیونکہ وہ اس کی بعض عادات کو ناپسند کرتی تھی خصوصاً اس کی ہم جنسی کی عادت پر اسے سخت لعنت ملامت کرتی تھی۔ کچھ عرصے پہلے اس کا باپ اس کی آوارگی سے تنگ آگیا تھا۔ اور اس نے اسے ملازمت تلاش کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اور اس کے خرچ میں کمی کر دی تھی۔ اس لئے اس کا باپ کے ساتھ جھگڑا ہوا تھا۔

چند سال پہلے ایک عجیب واقعہ رونما ہوا تھا۔ اس وقت ہارلو اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ جس کمرے میں رہتا تھا اس میں گاہے گاہے آگ بھڑک اٹھتی تھی اور کاغذات جلنے لگتے تھے۔ اس کے ماں باپ فوراً آگ پر قابو پا لیتے ایک بار ہارلو کے کپڑوں کی الماری اور دروازوں کے پردوں میں آگ لگ گئی۔ اس کے باپ نے ٹیلیفون پر فائر سٹیشن کو اطلاع دینی چاہی تو معلوم ہوا کہ ٹیلیفون کی تار کٹی ہوئی تھی۔ اس نے باہر جا کر پڑوسی کے مکان سے ٹیلیفون کیا۔ آگ بجھانے والے انجن اور عملہ پہنچا۔ لیکن آگ لگنے کا سبب معلوم نہ ہو سکا عملے کا اصرار تھا کہ یہ اس نوجوان کی شرارت ہے جو اس کمرے میں رہتا ہے۔ لیکن اس کے ماں باپ نے مداخلت کی۔

ہارلو اپنے ماں باپ کی موت کے چند ہی روز بعد عیاشی پر بے دریغ روپیہ خرچ کرنے لگا۔ اس نے ایک نئی قیمتی کار خریدی۔ اس نے دوستوں کو بڑی پرتکلف دعوتیں دیں۔

ہارلو جس ہوٹل میں ٹھیرا ہوا تھا۔ ایک روز اس ہوٹل کے ایک ملازم نے پولیس حکام کو یہ بات بتائی۔ کل ہارلو نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا کہ دیکھو میں اپنی وصیت تحریر کر رہا ہوں تم گواہ رہنا۔ میری موت کے بعد میرا تمام ترکہ ان لوگوں میں تقسیم ہو گا۔ اس نے جو نام بتائے تھے وہ اس کے دوست لڑکوں کے نام ہیں۔

سراغرسانوں کی رپورٹ کے مطابق ہارلو نے چند ہی ماہ میں ۹۶ ہزار ڈالر عیاشی کی نذر کر دیئے تھے اور وہ نہ جانے کیوں یہ خدشہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے دوست اس پر تشدد کریں گے۔

ایک روز سراغرساں نے دیکھا کہ ہارلو کا دوست ویمپین جو ہارلو کے ماں باپ کی موت کی خبر ملنے کے دن اس کے ساتھ تھا ایک نوجوان لڑکی کو ہوٹل میں لایا۔ یہ لڑکی بہت حسین، تیز اور ذہین تھی۔ وہ پہلے اقوام متحدہ کے دفتر استقبالیہ میں کام کر چکی تھی۔

یہ لڑکی جس کا نام جین ٹوری تھا۔ زیادہ وقت ویمپین کے ساتھ گزارتی تھی۔ سراغرساں دونوں کے پیچھے

www.taemeernews.com

لگاتھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔
ایک دن ہوٹل میں دونوں میں کچھ رازدارانہ باتیں ہوئیں اور لڑکی یکدم پریشان ہو گئی اور غصے میں اٹھ کر چلی گئی اس کے بعد وہ مستقل طور پر پریشان رہنے لگی۔ سراغرساں نے پولیس حکام کو بھی ہوٹل میں لاکر دور سے لڑکی دکھائی یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کے دماغ اور ضمیر پر بوجھ ہے جسے وہ اتار پھینکنا چاہتی تھی لیکن ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ کش مکش میں مبتلا تھی۔

چند ہی روز بعد جین لوری نے اپنے فیملی ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا اور بتایا: "میرے ایک واقف لڑکے نے انکشاف کیا ہے کہ اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر دوست کے ماں باپ کو زہر دیا تھا۔" ڈاکٹر نے کہا: "بہتر ہے تم پولیس کو اطلاع کر دو۔" لڑکی سوچ میں پڑ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ نئے عزم کے ساتھ اٹھی۔ اور پولیس کے دفتر میں پہنچ گئی۔ جہاں اس نے یہ داستان بیان کی۔ ڈیمپین اور ہارلو گہرے دوست تھے اور دونوں میرے ساتھ اچھا سلوک کرتے تھے۔ لیکن ڈیمپین مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور زیادہ محبت کرتا تھا میں بھی اسے پسند کرتی تھی۔ اس بات پر ان دونوں میں جھگڑا ہو گیا۔ چنانچہ ڈیمپین نے مجھے بتادیا کہ اس نے ہارلو کے ساتھ مل کر اس کے ماں باپ کو ۱۹ اگست ۱۹۵۲ء کو زہر دیا تھا۔ لیکن بعد میں ہارلو اپنے وعدے سے پھر گیا اور اس نے مجھے وہ رقم نہ دی جو وعدے کے مطابق مجھے ملنی چاہیے تھی۔ یہ ۱۶ دسمبر ۱۹۵۲ء کا دن تھا۔ پولیس نے ہارلو اور ڈیمپین دونوں قابو کر لیا۔ جس وقت وہ گرفتار ہوئے اس سے پہلی رات دونوں میں ہاتھاپائی ہوئی تھی اور دونوں کے چہروں پر خراشیں آئی تھیں۔
ڈیمپین نے پولیس کے سامنے اقبال جرم کرتے ہوئے جو کہانی بیان کی وہ یہ ہے: "ہارلو اپنی ماں کا ذکر ہمیشہ نفرت سے کیا کرتا تھا۔ لیکن جب اس کے خرچ میں کمی کر دی گئی تو وہ اپنے باپ کے بھی خلاف ہو گیا اور اس نے دونوں کو ٹھکانے لگانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ ہم نے پہلے یہ فیصلہ کیا کہ دونوں کو گولی مار کر ہلاک کیا جائے لیکن بعد ازاں یہ خیال بدل دیا۔ اور زہر دینے کا فیصلہ کیا۔ ہارلو کیمسٹری جانتا ہے اس نے شمپین میں زہر ملایا مگر اس کے اصل رنگ میں فرق نہ آنے دیا۔ ۱۸ اگست کی رات کے گیارہ بجے ہم زہر آمیز شمپین لے کر ہارلو کے گھر گئے۔ میں باہر ٹھہر گیا ہارلو اندر گیا اور اس نے اپنے باپ کو بتایا کہ اسے ملازمت مل گئی ہے اور وہ اس خوشی میں ان کے لئے شمپین لایا ہے چنانچہ اس نے درخواست کی کہ اس کا باپ اور ماں شمپین پی کر خوشی کا اظہار کریں۔ وہ راضی ہو گئے اس نے زہر آمیز شمپین ان کو پلادی اور خود دوسری بوتل کی شمپین پیتا رہا تھوڑی دیر بعد ہارلو نے مجھے اندر آنے کے لئے کہا چنانچہ میں اندر گیا تو دیکھا کہ اس کی ماں مردہ پڑی ہے اور باپ فرش پر پڑا تڑپ رہا ہے اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ہارلو نے اسے دھکا دے کر گرا دیا اور اس کے مونہہ میں مزید زہر آمیز شراب انڈیل دی۔ اسی طرح اس نے اپنی مردہ ماں کے مونہہ میں بھی تھوڑی سی اور شراب انڈیلی جب اسے اطمینان ہو گیا کہ دونوں مر گئے ہیں تو ہم واپس آگئے۔

ہارلو اپنی گرفتاری کے بعد جلد ہی پاگل ہو گیا۔ چنانچہ اس کی صحت یابی تک اس کو سزا دینے کا معاملہ ملتوی کرنا پڑا تاہم اسے جائداد سے محروم کرنے کا حکم فوراً سنایا گیا۔ ڈیمپین کو عدالت نے اعانت جرم میں بیس سال قید کی سزا کا حکم سنایا۔

www.taemeernews.com

بھوت کا سایہ

فاروق پراچہ

وہ دوسری عام گھریلو عورتوں کی طرح ایک سادہ سی خاتون ہیں۔ اگر آپ انہیں کسی سڑک پر دیکھ لیں تو آپ کو ان میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئے گی۔ جو آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکے۔ ان کے شوہر برسٹل میں ایک چھوٹے سے کارخانے کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت بھی کوئی غیر معمولی نہیں۔

لیکن یہ جوڑا جو عام طور سے تنہائی پسند کرتا ہے ان دنوں اپنے سینے میں ایک پراسرار راز پوشیدہ رکھے ہوئے ہے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا ان دونوں میاں بیوی کو کچھ حیرت انگیز واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان واقعات کی نوعیت کا ذکر کرتے ہوئے شوہر نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی

"رات کو سونے سے کچھ عرصہ پیشتر میں اور میری بیوی ادھر ادھر کی گفتگو میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لیکن حال ہی میں ہماری اس گفتگو میں ایک تیسری شخصیت بھی شامل ہو گئی ہے۔ اس نے مجھے میری بیوی کے توسط سے اپنا نام، پتہ اور اپنی موت کے اسباب بتائے ہیں۔

"اس شخص کو نہ تو میں جانتا ہوں اور نہ ہی میری بیوی کو اس کے بارے میں کوئی علم ہے۔ لیکن اس نے ہم کو کئی ایسے لوگوں کے بارے میں سینکڑوں باتیں بتائی ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں۔ ان میں سے کئی لوگ ایسے تھے۔ جن کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور ہمیں ان کے انتقال کی خبر نہیں تھی۔ لیکن بعد میں جب ہم نے اس سلسلے میں چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ واقعی ان کا انتقال ہو چکا ہے۔"

اس قسم کے پراسرار واقعات پر تحقیق کرنے والے اسے انوکھا واقعہ قرار نہیں دیتے۔ ان کے پاس کئی ایسی رپورٹیں موجود ہیں جن میں "بن بلائے" مہمانوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔"

عام طور سے جن لوگوں کو ان پراسرار واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ فوراً یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان پر کسی جن یا بھوت کا سایہ پڑ گیا ہے یا وہ کسی غیبی طاقت کے زیر اثر آ گئے ہیں۔ اس کے بعد وہ خود کو ایک ایسی مخلوق سمجھنے لگتے ہیں جو خون اور گوشت کے نظام سے مبرا ہے۔

لندن کی رہنے والی ایک خاتون ڈوریس کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس پر کسی غیبی طاقت کا غلبہ ہو جائے گا۔ وہ ایک ذہین اور باوقار خاتون تھی اور ایک سرکاری

www.taemeernews.com

بنا دیا تھا۔ دل کھول کر آنسو بہاتے تھے۔

اس واقعہ کے فوراً بعد ڈورلیس نے اپنے لئے ایک پائپ خرید لیا۔ اگرچہ وہ تمباکو نوشی نہیں کرتی تھی۔ لیکن جب اس پر ہاورڈ کی روح قبضہ کرتی تھی تو وہ پائپ پینا شروع کر دیتی تھی۔ ہاورڈ تمباکو نوشی کا رسیا تھا۔

ایک روز ڈورلیس نے بیٹھے بیٹھے اعلان کیا کہ ہم اسٹاک پوگس کے ایک مکان میں جا رہے ہیں، چنانچہ وہ اس کی ہمشیرہ اور ان کی ایک سہیلی بکنگھم شائر کے لئے روانہ ہو گئیں۔ راستہ میں ہاورڈ کی آواز نے ان سے درخواست کی کہ وہ پہلے ایک قریبی باغ سے اس کے لئے چند کیلے خرید لیں۔ اس باغ کے مالک نے بعد ازاں انہیں بتایا کہ ہاورڈ کو کیلے بہت پسند تھے اور وہ ہر روز یہیں سے کیلے خریدتا تھا۔

بکنگھم شائر پہنچ کر ڈورلیس نے ایک گھڑی ساز کی دکان کا رخ کیا۔ اس نے ہاورڈ کی آواز میں گھڑی ساز سے اپنی گھڑی طلب کی۔ لیکن جب اسے بتایا گیا کہ اس کی گھڑی ناقابل مرمت ہے۔ تو وہ قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔

"میرے انتقال کی خبر سن کر تم نے گھڑی بیچ دی تھی۔ لیکن یاد رکھو یہ بے ایمانی تمہیں راس نہیں آئے گی۔

وہاں پر موجود لوگوں نے جب گھڑی ساز سے اس بارے میں استفسار کیا تو اس نے بتایا کہ واقعی اس نے گھڑی بیچ دی تھی۔ لیکن اب وہ اس کا معاوضہ دینے کے لئے تیار ہے اس گھڑی ساز نے معاوضہ تو دیدیا لیکن چند دن بعد اس کے پاؤں پر فالج گرا اور وہ معذور ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ اسٹاک پوگس پہنچنے کے بعد ہاورڈ کی روح کے کہنے پر ڈورلیس کئی ایسے کام کرتی رہی اور کئی ایسے لوگوں سے ملتی رہی جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ یہ

محکمے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھی۔ ایک رات وہ اپنی ہمشیرہ کے ساتھ باتیں کر رہی تھی کہ اچانک اس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ اس کے جسم پر لمحہ بھر کے لئے کپکپی سی طاری ہو گئی بہن نے اس کی یہ حالت دیکھی تو اسے سنبھالنے کے لئے آگے بڑھی لیکن اتنے میں ایک مردانہ آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کیا میں آپ کی گفتگو میں مخل ہوا ہوں؟ میں کہاں ہوں؟ میرا نام لیبزلی ہاورڈ ہے۔ میرا خیال ہے آپ مجھے جانتی ہوں گی، کیونکہ میں مشہور فلمی اداکار ہوں۔" یہ الفاظ ڈورلیس ادا کر رہی تھی۔ لیکن آواز اس کی نہیں تھی۔

ڈورلیس کی ہمشیرہ کو معلوم تھا کہ اس نے بھی دوسری لاکھوں عورتوں کی طرح ۱۹۴۳ء میں اس مشہور فلمی اداکار کی موت پر جس کے طیارے کو جرمنوں نے گولیوں کا نشانہ

www.taemeernews.com

سلسلہ سال ڈیڑھ سال تک چلتا رہا پھر ایک روز ہارڈی نے اسے خدا حافظ کہا اور ہمیشہ کے لئے اپنا سایہ اس پر سے ہٹا لیا۔

ستمبر، ۱۹۵۷ء کی ایک سہ پہر کا ذکر ہے مس روشر اپنے کنگسٹن لندن کے فلیٹ میں بیٹھی اپنے کسی دوست کو خط لکھنے ہی والی تھی کہ اچانک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے ہاتھ میں دبا ہوا قلم خود بخود چلنے لگا ہو۔ اس نے لکھا:

"گورڈن کی طرف سے سلام محبت۔"

گورڈن مس روشر کے منگیتر کا نام تھا۔ ایک سال قبل وہ روشر سے شادی کرنے کی غرض سے برطانیہ پہنچنے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ ایک حادثے میں اس کا انتقال ہو گیا۔

روشر اس واقعے سے اتنی ہراساں ہو گئی کہ کچھ دنوں تک اس نے قلم ہاتھ میں نہیں لیا۔ ایک روز جب اس نے بڑی ہمت کرکے اس قلم کے ذریعہ پھر خط لکھنے کی کوشش کی تو اسے دوبارہ اسی واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔

بعد ازاں تحریروں کے ایک ماہر کو جب گورڈن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں دکھائی گئیں تو اس نے بڑے وثوق کے ساتھ اعلان کیا کہ گورڈن اور روشر کی تحریروں میں کوئی فرق نہیں۔

ایڈنا ڈمیٹیم لندن کی ایک گھریلو خاتون تھیں ایک روز وہ شام کے وقت غسل کرنے کے بعد شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بال بنا رہی تھیں کہ اچانک انہیں یوں محسوس ہوا جیسے شیشے میں ان کی جگہ کوئی اور عورت کھڑی ہے لمحہ بھر کے لئے ان کے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔ انہوں نے مختلف زاویہ بدل کر شیشے میں خود کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ شیشے میں نہ صرف ان کی شکل بدلی ہوئی نظر آرہی تھی بلکہ ان کے کپڑے اور حرکات و سکنات بھی مختلف تھیں اس موقع پر انہوں نے خود سے سوال کیا۔

"کیا یہ میں ہوں؟"

"نہیں" شیشے سے آواز آئی "آپ میرے پیچھے ہیں۔ اس لئے خود کو دیکھ نہیں سکتیں۔"

"آپ کون ہیں؟" ایڈنا نے کانپتے ہوئے سوال کیا۔

"میں آپ کی ہمدرد ہوں اور آپ کو یہ پیغام دینے آئی ہوں کہ تین ماہ بعد آپ کا انتقال ہو جائے گا۔"

شیشے میں ابھرنے والی شبیہ یہ کہہ کر آہستہ سے غائب ہو گئی۔ لیکن ایڈنا کئی دنوں تک بخار میں مبتلا رہی۔ اس واقعے سے ٹھیک تین ماہ بعد ایڈنا کو پیٹ کے درد کی وجہ سے ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ جہاں آپریشن کے دوران اس کا انتقال ہو گیا۔

ان واقعات کے بارے میں ماہرین نفسیات جو تشریحات پیش کرتے ہیں ان کے مطابق جب کوئی فرد کسی ذہنی انتشار کا شکار ہوتا ہے تو کئی پراسرار واقعات رونما ہونے لگتے ہیں۔ غیبی آوازیں سننے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اعصابی ہیجان کا مرض لاحق ہونے والا ہے یا آپ ایسے فریب کا شکار ہو گئے ہیں جو عام طور سے شدید ذہنی تھکاوٹ کے بعد رونما ہوتا ہے۔

ماہرین نفسیات اس سلسلے میں جو بھی توجیہات پیش کریں وہ بظاہر تو درست نظر آتی ہیں لیکن ایک بات پھر بھی یقینی ہے کہ انسان کی زندگی سے "پراسراریت" کے عنصر کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔ یہ "پراسراریت" ہر دور کے انسان کے ساتھ وابستہ رہی ہے اور رہے گی۔

www.taemeernews.com

اسلامی کتابیں

تاج بہشتی زیور مکمل و مدلل و محشی	مولانا اشرف علی تھانوی	مجلد ۱۵ روپے غیر مجلد ۱۲ روپے ۵۰ پیسے
ہمارے نبی کی پاک بیبیاں	مولانا مصطفےٰ احسن	۶۲ پیسے
مجدد اعظم (الف ثانی)	محمد حلیم	۲ روپے ۵۰ پیسے
اسلامی اخلاق	مولانا مصطفےٰ احسن	ایک روپیہ
رمضان کی باتیں	صادق علی بستوی	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
کتاب الطہارت	مفتی حفیظ الدین احمد	۶۲ پیسے
تبلیغی باتیں	مفتی حفیظ الدین احمد	۲ روپے ۵۰ پیسے
خدا کا انعام	وحید الزماں قاسمی	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
معارف السنۃ	مولانا احتشام الحسن	۴ روپے
معجزات النبی	مفتی حفیظ الدین احمد	۷۵ پیسے
اسلام کا تبلیغی نظام	مولانا عبدالقیوم ندوی	۸۷ پیسے
اسلامی تاریخی کہانیاں	مولانا عبدالمومن فاروقی	۲ روپے
شہیدِ اعظم	مولانا ابوالکلام آزاد	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
مدنی زندگی اور غزواتِ اسلام	مولانا عبدالقیوم ندوی	ایک روپیہ ۲۵ پیسے
نصائح زریں	مولانا مصطفےٰ احسن	۴۰ پیسے
اقوالِ زریں	مولانا مصطفےٰ احسن	۵۰ پیسے
اسلامی آداب	وحید الزماں قاسمی	ایک روپیہ ۵۰ پیسے
شرعی نماز	وحید الزماں قاسمی	ایک روپیہ
قرآنی دعائیں	مفتی سید محمود شاہ	ایک روپیہ
پیغمبری دعائیں	مفتی سید محمود شاہ	ایک روپیہ
نبیوں کا پاکیزہ بچپن اور جوانی	مولانا اخلاق حسین قاسمی	ایک روپیہ

مکتبہ دینیات ۔ آصف علی روڈ ۔ نئی دہلی ۱

آپ کا دماغ آپ کو مریض بناتا ہے

کیتھرین ایلن

کیا آپ کو یقین آئے گا کہ آپ کی بیماری، یہ درد، یہ تکلیف کسی جسمانی بیماری کا نتیجہ نہیں ہے؟ اس درد کا موجب کوئی خارجی چوٹ، کوئی غذائی بد احتیاطی نہیں ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ آپکی جسمانی تکالیف آپ کے ذہن کی پیدا کردہ ہیں لاشعوری خوف، تشنۂ تکمیل خواہشیں اس جسمانی بیماری اور درد کا روپ دھارے ہوئے ہیں۔ ایسی خواہشیں جو بچپن سے اب تک آپ کے لاشعور میں مدفون ہیں۔

نفسیاتی طبی سائنس کی تحقیق نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اکثر مریضوں کی تکالیف کی جڑیں ان کے ذہنوں میں ہوتی ہیں۔ ان کا محرک کوئی خارجی بیماری نہیں ہوتی۔ اس لئے ایسے مریضوں کا جسمانی علاج کے بجائے نفسیاتی علاج کرنا چاہیئے۔ احتیاطاً جسمانی علاج کے ساتھ ساتھ نفسیاتی علاج ضروری ہے۔

ممکن ہے آپ میں سے بعض کو اس بیان پر تعجب ہو۔۔۔ لیکن غور کرنے کے بعد یہ شکوک دور ہو سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ دو سال ہی سے طبیعات دوسری تمام سائنسوں سے علیحدہ ہوئی ہے، ورنہ دو سو سال قبل اس کا روحانیت جیسی دماغی سائنس سے گہرا تعلق تھا۔ اس وقت سے ہی ڈاکٹروں نے یہ تحقیق کی کہ جسمانی بیماریاں صرف جسم سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا علاج بھی جسمانی ہی طریقہ پر ہونا چاہیئے ۔۔۔ مثلاً بیماری پھیلانے والے جراثیم کا سدِ باب کر دیا جائے تو بیماری پھیلے گی نہیں۔

اس زمانہ سے قبل طبیعات، مذہبیات اور سحریات کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ نیم وحشی قبیلوں میں اب بھی طبیب، مذہبی پیشوا ہوتا ہے، جو جسمانی بیماری کا علاج بھی جادو ٹونے سے کرتا ہے۔

دو سو سال کی طویل مدت کے بعد آج پھر جسمانی بیماریوں اور ذہنی بیماریوں میں گہرا رشتہ جوڑا جا رہا ہے اور طبی نفسیات

www.taemeernews.com

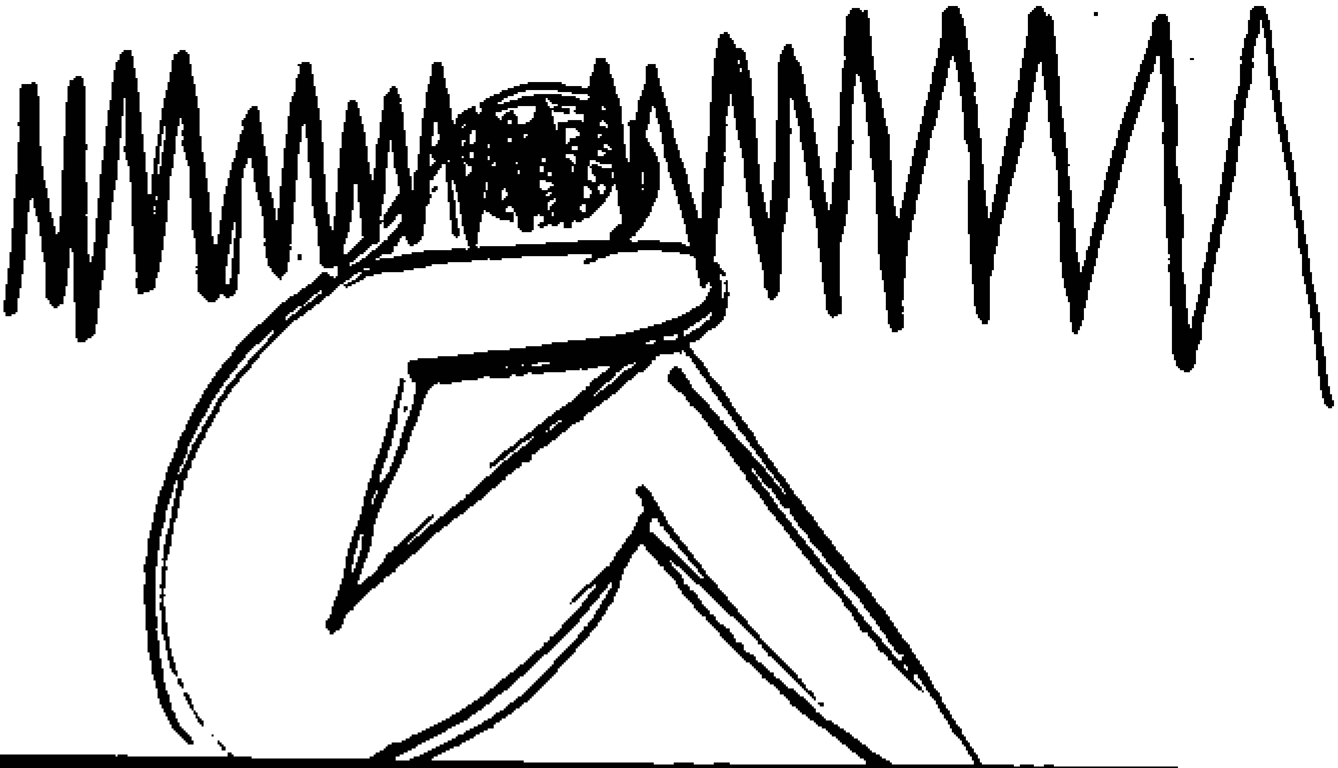

کے شہرۂ آفاق ماہرین اس تحریک میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

مثلاً ڈاکٹر فلینڈر ڈینبار نے اپنی کتاب   سے ہزاروں افراد کی آنکھیں کھول دی ہیں۔ موصوفہ نے اپنی کتاب میں بے شمار مثالیں دی ہیں۔

ایک مثال لیجئے:

ہسپتال میں ایک ۲۱ سالہ مریض داخل ہوا۔ کچھ عرصہ تک تو اس کی حالت سنبھلتی رہی لیکن پھر حالت بدتر ہوتی گئی معالج پریشان ہو گیا۔ بغیر کسی جسمانی علالت کے مریض کے سر میں درد شدید درد سے تڑپتا، متلی ہوتی۔

جب دواؤں سے یہ حالت نہ سنور سکی تو ڈاکٹر نے مریض کا جذباتی مطالعہ کرنا شروع کیا کہ شاید مریض کے بچپن کے ذہنی رجحانات سے موجودہ تکالیف کا پتہ چل سکے۔ اس نے مریض کے بچپن کے حالات معلوم کئے اور جلد ہی اس فیصلہ پر پہنچا کہ مریض کی ذہنی الجھنیں جسمانی بیماری کی شکل اختیار کئے ہوئے ہیں۔

موصوفہ لکھتی ہیں:

"مریض جب ۵۔۶ سال کا بچہ تھا اس وقت اس کا باپ ایک حادثہ میں زخمی ہو گیا تھا۔ اس حادثہ کے بعد ۱۲، ۱۵ برس تک باپ کو سر درد اور متلی کی شکایت رہی جس سے مریض بہت متاثر ہوا۔

۱۸ برس کی عمر میں ایک حادثہ میں مریض کے سر میں چوٹ لگی جس سے کچھ دن تک معمولی سر درد ہوتا رہا۔ اب جبکہ ہسپتال میں وہ بستر پر لیٹا رہتا ہے خیال آرائیاں کرنے کے لئے کافی وقت ملتا۔ وہ پریشان ہوا کہ کہیں وہ بھی اپنے باپ کی طرح سالہا سال تک قائم رہنے والا سر درد کا شکار نہ ہو جائے، اس خوف نے حقیقی شکل اختیار کر لی۔

ڈاکٹر نے مریض کو بتایا کہ چند سال قبل جب اس کے سر میں چوٹ آئی تھی، تو دماغ کے کسی حصہ کو ضرب نہ لگی تھی، اس وقت جو سر درد ہوا تھا وہ اس کے خوف کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ جب تک وہ ہسپتال میں ہے، وہ زیادہ سے زیادہ مصروف رہنے کی کوشش کرے، دوسرے مریضوں سے باتیں کرے، اخبارات اور کتابیں پڑھے۔ کوئی ایسا ہنر سیکھے جس کو وہ بستر پر لیٹے ہی لیٹے سرانجام دے سکتا ہو۔ مریض نے ڈاکٹر کے مشورہ پر عمل کرنے پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔

موصوفہ لکھتی ہیں کہ ایک ہفتے کے اندر ہی اندر سر درد اور متلی ختم ہو گئی۔ بچپن سے جو خوف اس کے دل و دماغ میں سمائے تھے ان کی جڑیں اکھڑ گئیں۔

اس مریض کے واقعات سے طبی نفسیات کا ایک اصول وضع ہوتا ہے کہ جن بیماریوں کا تعلق جذبات سے ہے، ان کی

www.taemeernews.com

ابتدا ر بچپن سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ڈنبار لکھتی ہیں کہ بچے کے خوف اور جذباتی ہیجانات فوراً ہی اپنا اثر نہیں ڈالتے۔ بلکہ کئی کئی سال کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، جبکہ بچہ بڑا ہو جاتا ہے اور بچپن کے واقعات فراموش ہو جاتے ہیں۔

لیکن درحقیقت یہ حادثے فراموش نہیں ہوتے۔ بلکہ تحت الشعور میں جا چھپتے ہیں اور جوانی کے ان لمحات کا انتظار کرتے ہیں جبکہ ان کو ابھرنے اور دوبارہ سطح شعور پر آنے کا موقعہ ملتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے خوف صرف ذہنی بیماریاں، جیسے نیوراتی یا پاگل پن، کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ کبھی ایسی جسمانی بیماریوں کی شکل اختیار کرتے ہیں، جن کی کوئی جسمانی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

ایسا جب ہوتا ہے جبکہ بچہ کو کوئی شدید دھچکہ لگے۔ مثلاً کوئی محبوب ہستی داغِ مفارقت دے جائے۔ اس اچانک موت سے بچہ ایسی بیماریوں کی چھوت میں آجاتا ہے جو عام طور سے چھوت کی بیماریاں نہیں کہلاتیں مثلاً دل کا درد، شکمی درد وغیرہ۔

بچہ جب کسی محبوب ہستی ماں، باپ، بھائی، بہن یا چچا یا ماموں کو کسی بیماری میں مبتلا دیکھتا ہے۔ اور پھر اس بیماری سے اس محبوب ہستی کی موت واقع ہوتی ہے، تو بظاہر کچھ دنوں کے بعد بچہ اس بیماری کو بھول سا جاتا ہے لیکن سالہا سال کے بعد —— کسی ہیجانی کیفیت میں وہ بھولی بسری یاد دوبارہ ابھرتی ہے اور نوجوان کو اپنے شکنجوں میں جکڑ لیتی ہے۔

اس سے یہ نہ سمجھئے کہ ایسی بیماریاں محض فرضی ہوتی ہیں —— جی نہیں —— وہ درحقیقی بیماریوں کی طرح ظاہر ہوتی ہیں مریض درد محسوس کرتا ہے، دل کمزور ہوتا ہے۔ اعصاب مجبور نظر آتے ہیں۔ جس کی تصدیق ڈاکٹری معائنہ سے کی جا سکتی ہے صرف اک جسمانی حالت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

مثلاً شکمی درد کو لے لیں۔ ایسے درد کی ابتدا تو بچپن کے کسی واقعہ سے ہوتی ہے مگر شکمی اعضار اور پٹھے کمزور ہو جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ مریض شکمی سرطان جیسی موذی بیماری کا شکار ہو جاتا ہے۔

اور یہ ہوتا ہے اس وجہ سے کہ اعصاب اور جسمانی اعضار کا گہرا تعلق ہے۔ بچپن میں کسی خوف یا حادثہ سے جسم کے بیشتر اعضار فوری اثر قبول کرتے ہیں۔

ڈاکٹر ڈنبار نے دل کی بیماری کی مثال پیش کی ہے، جس سے ہر سال کروڑوں انسان دنیا کے ہر حصہ میں اپنی جانیں تلف کرتے ہیں۔ خود موصوفہ کئی سال تک ایک ہسپتال میں دل کے مریضوں کا مشاہدہ کرتی رہی ہیں۔ ان کی تحقیق ہے کہ دل کے مریضوں کی پچاس فی صدی مریضوں کی زندگی کے واقعات بتاتے ہیں کہ انہوں نے اپنے عزیز ترین ہستیوں کو دل کا مریض اور اس کی وجہ سے مرتے دیکھا ہے۔ اس سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دل کی بیماریاں موروثی حیثیت رکھتی ہیں لیکن تصویر کا دوسرا رخ بھی بھولنا نہ چاہیے۔

موصوفہ نے مریضوں کے واقعات کا گہرا مطالعہ کیا تو ۹۸ فی صد مریضوں نے بتایا کہ ان کی عزیز ترین ہستیاں اس بیماری کا شکار ہوئیں۔ اس دھچکہ سے جو خوف مریض کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ موروثی حیثیت سے کہیں زیادہ تباہ کن ہے۔

بیشتر امراض بچپن سے شروع ہوتے ہیں۔ اگر بچوں کی تربیت میں احتیاط برتی جائے۔ ان کو کسی جذباتی ہیجان کا شکار نہ ہونے دیا جائے تو کثیر تعداد میں مہلک بیماریوں کا سدباب ممکن ہے۔

بچوں کو محبت اور آزادئ عمل کی ضرورت ہے۔ اگر یہ دونوں ان کو مہیا ہیں تو وہ قوم کے تندرست فرد ثابت ہو سکتے ہیں۔

www.taemeernews.com

دینی کتابیں

رسولِ خدا کے اخلاق	۵۰ پیسے	شہیدِ اعظم	ا روپیہ ۵۰ پیسے
دربارِ رسالت کے فرمان	۴۰ پیسے	معجزات النبی	۷۵ پیسے
سیرت حضرت ابوبکر صدیقؓ	ایک روپیہ	اسلام کیا سکھاتا ہے	۲ روپے
سیرت حضرت عمر فاروقؓ	۲ روپے	خدا کا انعام	ا روپیہ ۲۵ پیسے
سیرت حضرت عثمان غنیؓ	ایک روپیہ	اسلامی اخلاق	ایک روپیہ
سیرت حضرت علی	ایک روپیہ	قرآنی دعائیں	ایک روپیہ
حیات سرورِ کائنات صلعم (حصہ اول)	۴ روپے ۲۵ پیسے	نصائح زرّیں	۴۰ پیسے
حیات سرورِ کائنات صلعم (حصہ دوم)	۳ روپے ۵۰ پیسے	مجددِ اعظم (الف ثانی)	۳ روپے
انسانیت کا پیغام	ا روپیہ ۷۵ پیسے	معارف السنۃ	۴ روپے
آثارِ نبوت	۲ روپے	اسلامی آداب	ا روپیہ ۵۰ پیسے
روحانی عورت	۲ روپے	مدنی زندگی اور غزوات اسلام	ا روپیہ ۲۵ پیسے
قرآن اور عورت	ایک روپیہ ۲۵ پیسے	کامیاب فال نامہ	ایک روپیہ
اچھا خاوند	ایک روپیہ ۲۵ پیسے	اسلام کا تبلیغی نظام	۸۷ پیسے
اچھی بیوی	ایک روپیہ ۲۵ پیسے	حیات المسلمین (عکسی)	۲ روپے
درسِ قرآن	۲ روپے	پیغمبری دعائیں	ایک روپیہ
آخرت کا سفرنامہ	۲ روپے ۵۰ پیسے	نبیوں کا پاکیزہ بچپن اور جوانی	ایک روپیہ
اعمالِ قرآنی	ایک روپیہ	مجاہدین سسلی	۸ روپے
ہمارے نبی کی پاک بیبیاں	۶۲ پیسے	رمضان کی باتیں	ا روپیہ ۵۰ پیسے
سیرت فخرِ دو عالم	۴ روپے	کتاب الطہارت	۶۲ پیسے
اسلامی تاریخی کہانیاں	۲ روپے	تبلیغی باتیں	۲ روپے ۵۰ پیسے
شاہنامۂ اسلام (چار جلدوں میں) رف گلیزڈ	۸ روپے	تاج بہشتی زیور مکمل و مدلل محشیٰ (مجلد)	۱۵ روپے
شاہنامۂ اسلام (چار جلدوں میں) سفید گلیزڈ	۱۲ روپے	تاج بہشتی زیور مکمل و مدلل محشیٰ (غیر مجلد)	۱۲ روپے ۵۰ پیسے

مکتبہ دینیات آصف علی روڈ، نئی دہلی

انقلابات ہیں زمانے کے.....

شاہد عظیم

جب انسان کو انتہا درجہ ذلیل و خوار کیا جائے تو بغاوت کی وہ چنگاری جو اولادِ آدم کی سرشت میں ہوتی ہے ایک جاں سوز آتش کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر انسان کے اندر ایک ایسا ساز ہے جو کبھی مضرابِ بیداری سے چھو جائے تو اس سے نغمۂ انقلاب کی صدا اٹھتی ہے۔ جب انسان کو دوسروں کی بلندی اور اپنی پستی کا احساس ہو تو وہ بلند و پست کے امتیازات مٹانے پر کمربستہ رہتا ہے۔ احساسِ بیداری ملت کے نوجوانوں کو آتشِ استبداد فرو کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جوں ہی یہ نوجوان ان آتش کدوں میں قدم رکھتے ہیں، آگ سرد ہو جاتی ہے۔ آتش کدوں کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ مسلح دربان اور مقدس محافظ انہیں خوفناک شعلوں میں دھکیل دیتے جاتے ہیں — صدیوں کی تیرہ بختی ختم ہو جاتی ہے اور نشترِ انقلاب کی جراحت جسمِ ملت کو زخموں سے پاک کر دیتی ہے۔

"انقلاب"۔ لاہور

★

رومیوں نے قرطاجنیوں کو شکست دینے کے بعد یہ شرط پیش کی کہ فوراً شہر خالی کر کے، امیل کے فاصلے پر دوسرا شہر آباد کریں۔ لوگوں پر مُردنی چھا گئی۔ اس موقع پر ایک مقرر نے تقریر کرتے ہوئے کہا "دیوتا ہماری قوم پر ہمیشہ مہربان رہے اور ہمیں سرخرو، سربلند اور مالا مال رکھا لیکن روم کے ذلیل النفس اور سنگدل کمینے ہم پر حسد کرتے ہیں اور مدت سے ہمارے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے خونریزیاں ختم کرنے کے لئے ایسی شرطیں منظور کر لی تھیں۔ جس کی کسی شریف قوم سے توقع ہو سکتی ہے، لیکن اب وہ ہم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم اپنا وطن بھی ان کے

www.taemeernews.com

حوالے کردیں، یہ ناممکن ہے ہم مرجائیں گے مگر اپنا وطن اور یہ مقدس سرزمین دشمن کے حوالے نہ کریں گے۔ ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھ گئیں، حوصلے ابھر گئے۔ معرکہ کی جنگ ہوئی سڑکوں پر مورچے بن گئے۔ ایک ایک مکان کو فتح کرنے کے لئے ایک ایک قدم پر روسیوں کو اپنا خون بہانا پڑا۔ قرطافن میں آگ لگادی گئی جو تین دن تک جلتا رہا۔

وہ زریں عہد تھا، وہ بدترین دور تھا جب روشنی ہی روشنی تھی، جب تاریکی ہی تاریکی تھی، جب نقرئی قہقہے تھے جب دل سوز چیخیں تھیں، جب زندگی کے ترانے تھے جب موت کا نوحہ تھا، جب پھولوں کی مہک تھی، جب کانٹوں کی چبھن تھی، جب بہار کی رنگینی تھی، جب خزاں کی پژمردگی تھی۔ جب ایوانوں میں روشن فانوس تھے جب جھونپڑیوں میں آہوں کا دھواں تھا۔ جب ہر طرف جنت کا سماں تھا جب ہر طرف جہنم کے شعلے تھے۔ جب سب کچھ تھا جب کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کہانی اُس دور کی ہے۔ اُس دور کی جب مولسے نیور روشنی اور دھوئیں میں سے گزر رہا تھا۔ چار گھوڑوں کی بگھی پر سوار قیمتی پوشاک پہنے یوں بیٹھا تھا۔ جیسے زندگی کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے اور کفنی بھی۔ فرانس کے بہت بڑے امراء میں سے ایک تھا۔ شاہی دربار میں خاصا اقتدار تھا اور زمانہ بھی وہ تھا جب امراء اور حکام ہی سیاہ سفید کے مالک تھے اور غریب عوام کی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر تھی۔

مولسے نیور غرور اور نخوت کا مجسمہ بن کر اپنی سیٹ پر اکڑ کر بیٹھا تھا۔ چار گھوڑوں کی بگھی برق رفتاری سے گلیوں میں سے گزر رہی تھی۔ دفعتاً ایک فوارے کے نزدیک گاڑی اس تیزی سے مڑی۔ اس کے ایک پہیئے کے نیچے کسی چیز کے آجانے سے شدید جھٹکا محسوس ہوا اور دیکھا آس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کے مونہہ سے چیخیں نکل گئیں۔ گھوڑے

www.taemeernews.com

اس جھٹکے سے پیچھے ہٹے اور مُڑک گئے۔ دراصل گاڑی کے
رُکنے کا سبب یہی گھوڑوں کا خود رکنا تھا، ورنہ شاید
گاڑی چلی جاتی، کیوں کہ ایسے واقعات تو اکثر پیش آیا کرتے
تھے کہ برق رفتار گاڑیاں اپنے زخمی کیے ہوتے کچلے ہوتے
لوگوں کو چھوڑ کر چلی جایا کرتی تھیں۔

خوف زدہ ملازم فوراً گاڑی سے اترا۔ مونسے نیور نے
بڑے اطمینان سے جماہی لیتے ہوئے پوچھا کیا ہوا؟ اسی دوران
ایک لمبے آدمی نے گھوڑوں کی ٹانگوں کے درمیان سے
ایک بچّے کی لاش نکالی اور اسے سڑک کے کنارے رکھ دیا
اور اس کے ساتھ ہی وہ بے اختیار چیخ چیخ کر رونے لگا۔
ملازم نے جھک کر مونسے نیور کے کان میں سرگوشی کی:
"اس آدمی کا بچہ گاڑی کے نیچے آکر کچل گیا ہے ـــــ"
مونسے نیور نے جماہی لیتے ہوئے بے زاری سے کہا "توبہ،
کس قدر نفرت انگیز چیخیں ہیں، کتنی سمع خراش!" ـــــ اور
لوگوں کی آنکھیں مونسے نیور کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔
انہیں لوگوں میں سے چیخنے والے نے بھی پُرنم آنکھوں سے
مونسے نیور کو دیکھا تو اس نے فوراً جیب سے ایک سکّہ
نکالا اور اس آدمی کے قدموں میں وہ سکّہ اس انداز
سے پھینکا جیسے مونسے نیور نے بچّے کی قیمت ادا کر دی ہے
اس کے ساتھ ہی مونسے نیور نے ملازم کو حکم دیا، گاڑی
چلاؤ۔ ہوا میں ایک چابک لہرائی گئی، گھوڑے سرپٹ
دوڑنے لگے۔ مونسے نیور غرور و نخوت کا مجسمہ بن کر سیٹ
سے ٹیک لگا رہا تھا، کہ یکایک اس کی جھولی میں وہی سکّہ
آن گرا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا وہ سکّہ دیکھا لیکن یہ نہ
دیکھ سکا کہ اب اس سکّے پر بغاوت کی چھاپ لگ گئی ہے۔
اس بغاوت کی جو انقلابِ فرانس کا باعث ہوئی۔

دو شہر ایک کہانی۔ چارلس ڈکنز

★

جب اہلِ روما نے کارتھیج کا محاصرہ کر لیا اور شہر
والوں کو اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے
اپنے معبدوں کی مورتیاں اور گھنٹے پگھلا کر ان کی تلواریں ڈھال
لیں۔ عورتوں نے اپنے لمبے اور خوبصورت بال کٹوا دیے
تاکہ ان سے جہازوں کو چلانے کے لئے رسّے بنائے جا سکیں۔

★

جب پیرس کے ہزاروں بھوکے اور فاقہ مست لوگوں
نے ہائے روٹی، ہائے روٹی کا شور مچاتے ہوئے پیرس کے شاہی
محل کو گھیر لیا تو ملکہ میری نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر پوچھا:
"یہ کیا شور ہے ـــ یہ لوگ کیا چاہتے ہیں؟"
ملکہ کو بتایا گیا "لوگ بھوکے ہیں، انہیں روٹی نہیں
ملتی"۔ اس پر ملکہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا "اگر روٹی نہیں
ملتی تو یہ لوگ کیک کھا کر گزارہ کیوں نہیں کرتے؟"

★

فضا میں دبی دبی سرگوشیاں تھیں وہی سرگوشیاں جو
کل تک دلوں میں تھیں مگر ابھی تک فضا میں سنائی دینے کے
باوجود ان سرگوشیوں کا مفہوم واضح نہ ہوا تھا۔ لوگوں کے سہمے
ہوئے چہرے اور اداس آنکھیں اس مفہوم کو تو واضح کر دیتیں
لیکن دہشت اتنی تھی کہ کوئی بھی یہ ظاہر نہ کرتا تھا کہ وہ ان
سرگوشیوں کے مفہوم سے واقف ہے لیکن ایک شام کھلے
بندوں یہ مفہوم واضح ہو گیا۔

یکایک یہ سرگوشی ایک چیخ بنی، ذرا سی بات تھی۔
ہوا یوں کہ زوروکوف کی پنڈلی کو کتے نے کاٹ کھایا۔
لوگوں نے بڑی مشکل سے چھڑایا کتے کے ساتھ کتے والا بھی تھا
اور کتے والا یوں نظر آتا تھا جیسے وہ خودکشی کا پالتو کتا
ہے گشتی سپاہی نے اسے برا بھلا کہا۔ اس دوران کتے والا

www.taemeernews.com

بار بار کچھ کہنا چاہتا لیکن سپاہی گھن گرج سے اس کی آواز سنائی نہ دیتی اور جب سپاہی چالان لکھ چکا اور کتے والے کو چالان کی رسید دینے لگا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا "جانتے ہو کس کا کتا ہے؟"

"کس کا ہے؟" "یہ تو زار روس کے جنرل کا کتا ہے" یہ سنتے ہی سپاہی نے رُخ بدلا اور زور دو کوف پر برس پڑا "اندھے ہو، دیکھ کر نہیں چلتے" اور اس پر برستے برستے جب سپاہی الٹا اس کا چالان کیا تو یکایک دبی دبی سرگوشیاں معنیٰ خیز انداز سے فضا میں پھوٹ پڑیں اور لوگوں نے ایک آواز ہو کر زار روس کے تمام پاگل کتوں کے خلاف کھلے بندوں آواز اٹھائی، اور آخر ایسی اجتماعی آواز نے انقلاب روس کا نعرہ بلند کیا —— اور پھر کئی پالتو کتوں کو سر بازار چیر پھاڑ کر رکھ دیا گیا۔

پالتو کتے - چیخوف

★

دنیا میں جتنی طاقت، دہشت زدہ زندگی کو پھیلانے کی خاطر خرچ کی جاتی ہے اور جس قدر دولت درباروں اور چھاؤنیوں میں ضائع کی جاتی ہے، اگر اس کا نصف یا چوتھائی حصہ بھی انسان کو روشن دماغ بنانے میں صرف کیا جائے تو پھر اس دنیا میں قلعے اور چھاؤنیوں کی ضرورت ہی نہ رہے۔

وکٹر ہیوگو

★

کل پنجشنبہ ۲۵، مئی کو اول روز بڑے زور کی آندھی آئی۔ پھر خوب مینہ برسا۔ وہ جاڑا پڑا کہ تمام کرہ شہر زمہریر ہو گیا۔ بڑے دریبے کا دروازہ ڈھا دیا گیا یا قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹا دیا گیا۔ کشمیری کٹرہ کی مسجد زمین کا پیوند ہو گئی۔ سڑک کی وسعت دو چند ہو گئی۔ اللہ اللہ گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں ایک شیر زور آور پیل تن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جا بجا ڈھاتا پھرتا ہے فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں جن کو عوام کنگری کہتے ہیں، ان میں سے ہلا ہلا کر ایک ایک کی بنیاد ڈھا دی۔ اینٹ سے اینٹ بجا دی —— واہ رے بندر یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر —— اور اب تو یہ فکر پڑی ہوئی ہے کہ رہتے کہاں اور کھاتے کیا۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب - میرزا غالب کا روزنامچہ

★

.... جب شاہی قیدی موجودہ جیل خانوں کے قریب پہنچے تو ہڈسن صاحب نے بادشاہ اور زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کی پالکیوں کو ایک طرف ٹھہرایا اور میرزا مغل، میرزا خضر سلطان، میرزا ابوبکر اور میرزا عبداللہ چاروں شہزادوں کو رتھوں سے اتارا اور اپنے ہاتھ سے ان کو قتل کر کے ایک چلو خون کا پیا اور کہا کہ اگر میں ان کا خون نہ پیتا تو میرا دماغ خراب ہو جاتا، کیوں کہ ان لوگوں نے میری قوم کی بے کس عورتوں اور بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا اور ان کے دیکھنے سے میرا خون جوش کھاتا تھا۔

شہزادوں کے قتل کے بعد ان کے سر کاٹے گئے اور سروں کو بادشاہ کے سامنے لایا گیا اور ہڈسن صاحب نے کہا "یہ آپ کی نذر ہے جو بند ہو گئی تھی اور جس کو جاری کرانے کے لئے آپ نے غدر میں شرکت کی تھی۔

بہادر شاہ نے جوان بیٹوں اور جوان پوتوں کے کٹے ہوئے سر دیکھے تو حیرت انگیز استقلال سے ان کو دیکھ کر مونہہ پھیر لیا اور کہا "الحمد اللہ، تیمور کی اولاد ایسی

www.taemeernews.com

ہی سرخرو ہو کر باپ کے سامنے آیا کرتی تھی"۔
اس کے بعد شہزادوں کی لاشیں کوتوالی کے سامنے لٹکائی گئیں اور سر جیل خانے کے سامنے خونی دروازہ پر لٹکا دیئے گئے ——

"دہلی کی جاں کنی"

ہندوستان میں ۱۸۵۷ کا انقلاب —— خواجہ حسن نظامی

★

فرانس کے مردہ خانے میں ایک نہیں کئی لاشیں ہیں!
لاشوں کے اس ڈھیر میں انسانیت، آزادی، انصاف اور جمہوریت کی لاشیں نمایاں ہیں۔ ان گلی سڑی لاشوں کے درمیان خون آلود تخت بچھا ہے جس پر ایک بوڑھا بڑے طمطراق سے بیٹھا ہے۔ اس کی خونخوار آنکھیں ایک اور لاش پر گڑی ہیں۔ یہ وہ لاش ہے جو لاش نہ بن سکی۔ ابھی تک زندہ ہے۔ اسے مردہ بنانے کے لئے ظلم و تشدد کی ہزار ہا ترکیبیں آزمائی جا چکی ہیں لیکن وہ ابھی تک زندہ ہے۔ بوڑھا خوں خوار اس کی زندگی سے زچ ہو گیا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح اپنے تیز ناخنوں سے اس کے جسم کو نوچتا ہے جسم سے ٹپکنے والے خون کے ہر قطرے کو شراب میں گھول کر پی جاتا ہے۔ گزشتہ ایک سو ستائیس برس سے اس خونی بوڑھے کا یہی مشغلہ ہے! اس سے خود اس کے وجود پر مردنی چھا رہی ہے اور وہ لاش زندگی سے ہمکنار رہ کر زندہ و تابندہ ہوتی جا رہی ہے اس تابندہ زندگی کا نام جمیلہ ہے۔

جمیلہ اس مادرِ وطن کا مقدس نام ہے جسے الجزائر کہتے ہیں۔

یہی الجزائر جس کی ہر صبح خونیں شفق سے طلوع ہوتی ہے اور جس کی ہر شام موت کے سائے میں بھیانک ——

www.taemeernews.com

بن جاتی ہے ـــــ الجزائر آزادی اور انسانیت کا یہ زندہ نشان فرانس کے مردہ خانے میں قید ہے۔ مردہ خانے کے باہر دنیا کے مہذّب اور آزادی پسند انسانوں کا گروہ چیخ رہا ہے۔ جمیلہ کو باہر آنے دو، اسے آزاد کر دو۔ جمیلہ کو اس کی زندگی دے دو۔ لیکن زندگی کا دشمن مردہ خانے میں مردہ جذبات کے ساتھ بدست پڑا ہے۔

یکایک یہ آواز اسے چونکا دیتی ہے۔ "تم جمیلہ کے دشمن نہیں، انسانیت اور آزادی کے دشمن نہیں بلکہ خود اس فرانس کے بدترین دشمن ہو جو کبھی انقلابی افکار اور انقلابی کردار کا سرچشمہ تھا۔ آج اس فرانس کا دامن جمیلہ کے خون سے داغ دار ہو رہا ہے، آج وہی دامن فرانس کا کفن بن رہا ہے۔۔۔۔"

خون خوار بوڑھا اس کفن کو سرکاتے ہوئے انسان پسندوں کو قہر آلود نگاہوں سے گھور رہا ہے دنیا اس کی آنکھوں سے متاثر نہیں ہوتی، احتجاج کئے جاتی ہے۔

اور وہ یوں دیوانہ وار پھوٹ پڑتا ہے "دور ہو جاؤ یہاں تمہاری شنوائی نہیں ہو سکتی ـــــ یہ دیکھو اس مردہ خانے میں جون آف آرک کی راکھ پڑی ہے ـــــ یہ وہی فرانس ہے جس نے اپنی جون آف آرک کو نذرِ آتش کرنے میں دریغ نہ کیا تو پھر اس جمیلہ کی بساط ہی کیا، میں وہی بوڑھا ہوں، اسی خون آلود تخت کا وارث، جس نے ہر دور میں فرانس کے مردہ خانے کو زینت و زیبائش کے لئے آزادی، انصاف اور جمہوریت کی لاشیں کھڑی کیں۔ میں ہر دور میں زندہ رہا ہوں۔ ہر دور میں مختلف صورتوں کے ساتھ اپنی حیثیت برقرار رکھتے ہوئے مردہ خانے کو سجاتا رہا ہوں۔ اسی سج دھج کا مجھے ایک بار پھر موقع ملا ہے اور میں خوش ہوں کہ میں وہی بوڑھا ہوں جس نے جون آف آرک کو زندہ آگ میں جلایا اور آج الجزائر کو اس جمیلہ کو مردہ بنا کر چھوڑ دوں گا۔

www.taemeernews.com

لیکن جمیلہ کی آواز مردہ خانے میں گونجتی ہے۔

"یہ تیری خود فریبی ہے، یہ تو خوب جانتا ہے کہ آج تک الجزائریوں کی حب الوطنی کو کچلنے کے لئے جو فوجی کارروائیاں کی گئیں اور ظلم و تشدد کے جن حربوں کو آزمایا گیا وہ ہر لحاظ سے بے کار ثابت ہوتے ہیں —— پانچ لاکھ سے زیادہ محبانِ وطن تیری سنسناتی گولیوں سے چھلنی ہو کر اپنی سرزمین کو اپنے خون سے سیراب کر چکے ہیں، اس لئے کہ ان کے ہونٹوں پر فقط ایک ہی لفظ ہے کہ ہم ایک کروڑ الجزائری غلام بن کر زندہ رہنے پر ایک کروڑ لاشیں بننے کو ترجیح دیں گے۔"

جمیلہ — آزادی کی مشعل —— الجزائر

★

ویت نام: مارچ ۱۹۵۲

میں نے آزاد علاقے میں ایک ہزار کیلومیٹر کی مسافت طے کی ہے۔ اس عوامی جمہوری علاقہ کا سربراہ ہوچی منہ کسی الف لیلوی کردار کی طرح لوگوں کے دلوں میں گھر کر چکا ہے۔ لاڈ نسل کی عوامی فوج ان دنوں پوربی شاہراہوں پر مقیم فرانسیسی فوج کے آہنی مورچے توڑتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔

زندگی بظاہر پرسکون لیکن آتش فشاں کی طرح شعلہ بار اور بنجر چٹانوں کی طرح سنگین ہے۔ رات کے اندھیرے میں، دھان کے کھیتوں میں کسانوں کی ٹولیاں مرد اور عورتیں بوڑھے اور بچے فصلوں کی نگہداشت کے لئے نکل آتے ہیں۔ کھیت جوتتے ہیں، پکی ہوئی فصلوں کو سینے سے لگاتے ہیں اور صبح کے جھٹ پٹے میں جب افق پر سپیدہ سحری کے ساتھ ہی فرانسیسی بمباروں کی ٹولیاں ابھرتی ہیں، یہ لوگ درختوں کی اوٹ میں چیونٹی کی طرح چھپ جاتے ہیں —— غلہ اگانے کے لئے دشمن فوجوں سے کھڑی فصلیں محفوظ رکھنے کے لئے اور سب سے بڑھ کر اپنے جوانوں کو چھپانے کے لئے کسانوں کو زبردست جنگ کرنی پڑتی ہے۔

گوریلا چھاپہ مار آ رہے ہیں، جا رہے ہیں —— فرانسیسی فوجیں بڑھ رہی ہیں، پیچھے ہٹ رہی ہیں، فصلیں پک رہی ہیں اور فصلیں جل رہی ہیں، تباہ کاریوں کا ایک چکر ہے، جو مسلسل چل رہا ہے توپوں کے مقابل ہوچی منہ کی حکومت ایک کڑی آزمائش سے گزر رہی ہے۔

جنگلوں میں فیکٹریاں قائم ہیں، یہ دفاعی چوکیاں ہیں جہاں ویٹ نام کا حریت پسند آزمائش کی بھٹی سے تپ کر نکل رہا ہے۔ بانس کے طویل شیڈ دھڑکتی ہوئی مشینوں کی گڑگڑاہٹ سے کانپ رہے ہیں۔ چھ سلنڈر کے انجن اور جنریٹر بجلی پیدا کر رہے ہیں۔ اب پرانی ریلوں کو بھٹی میں تپا کر توپوں میں ڈھال لیا جائے گا۔ شام تک تین ہزار دستی بم بن کر تیار ہو جائیں گے۔ یہ معمولی بم نہیں ہیں، میں نے ان کی تباہی دیکھی ہے یہاں پہاڑیوں میں پانچ چھاپے خانے پوشیدہ طور پر جاری ہیں۔ اخبارات پیدل چل کر تقسیم کئے جاتے ہیں یا سائیکل پر سوار ہو کر، یا پھر ٹرکوں میں لاد کر —— اخبار کے لئے بین الاقوامی خبریں ریڈیو سے لی جاتی ہیں۔

امریکی صحافی

جوزف اسٹاوین

کے ایک —— مضمون سے

ایک سال ہم سب سے ملواتا ہے

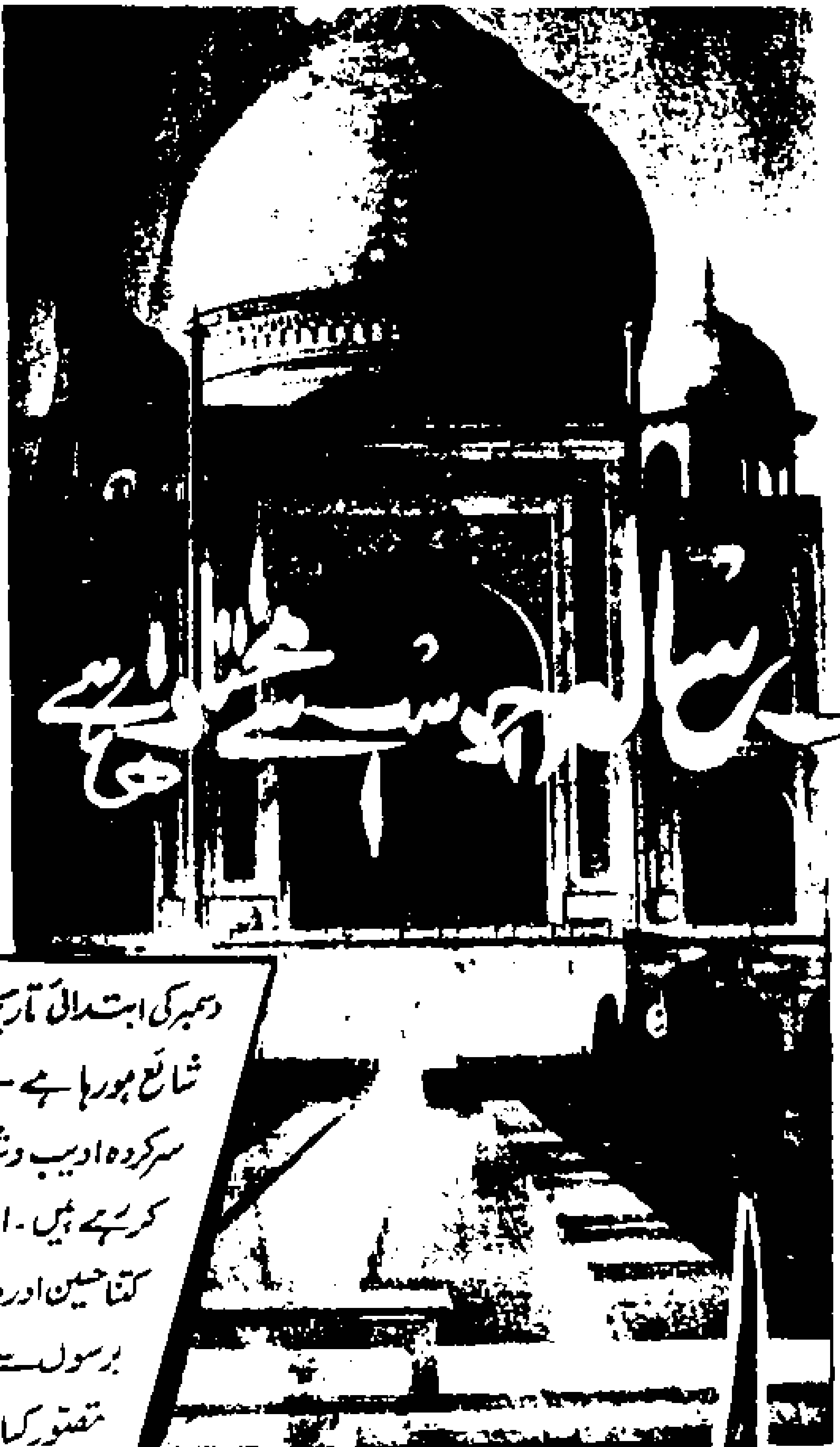

دسمبر کی ابتدائی تاریخوں میں آپ کے محبوب رسالہ بانو کا سال نامہ شائع ہو رہا ہے — ہندوستان اور پاکستان کے عظیم اور سرکردہ ادیب و شاعر اسے یادگار تحفہ بنانے میں ہماری معاونت کر رہے ہیں۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سال نامہ کتنا حسین اور دل چسپ ہوگا۔ کیوں کہ اب سے نہیں برسوں سے بانو کا سال نامہ ایسا ادبی سنگ میل تصور کیا جاتا رہا ہے جہاں اب تک بانو کے علاوہ کوئی نہیں پہنچ سکا۔ آج ہی دس روپے اور ستر پیسے (رجسٹری فیس) منی آرڈر سے بھیج کر خریداری قبول فرمائیے اور تین روپے قیمت کا یہ ضخیم سال نامہ آپ مفت حاصل کیجئے۔

یادگار تحفہ

بانو

سال نامہ

برائے ۱۹۶۹

ماہنامہ بانو، آصف علی روڈ، نئی دہلی نمبر ۱

www.taemeernews.com

غزل

نکھر آئی، نکھار آئی، سنور آئی، سنوار آئی
گلوں کی زندگی لے کر، گلستاں میں بہار آئی

مشیّت کو نہیں منظور دو دن پارسا رکھنا
اِدھر کی میں نے توبہ، اور اُدھر فوراً بہار آئی

اسیرانِ قفس کو واسطہ کیا اِن جھمیلوں سے
چمن میں کب خزاں آئی، چمن میں کب بہار آئی

مجھے گلشن سے، اے جوشِ جنوں صحرا کو تو لے چل
یہاں اِس کے سوا کیا ہے، خزاں آئی بہار آئی

ہمیشہ بادہ خواروں پر خدا کو مہرباں دیکھا
جہاں بیٹھے گھٹا اُٹھی جہاں پہنچے بہار آئی

نوح ناروی

محمد نوح نام اور نوح تخلص تھا۔ ۱۸ ستمبر ۱۸۸۹ء کو بھوانی پور ضلع رائے بریلی میں جنم لیا۔ ابتدا میں امیر مینائی اور جلال لکھنوی سے اصلاح لیتے رہے۔ لیکن ۱۹۰۰ء میں حضرت داغ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ ۱۹۰۲ء میں حضرت داغ دہلوی نے انہیں حیدرآباد دکن میں اپنے پاس ہی بلا لیا۔ سب سے پہلے داغ کی سند جانشینی ان ہی کو حاصل ہوئی۔ روانی، سادگی اور سلاست ان کے کلام کا خاصہ ہے۔ لیکن داغ کی سی شوخی اور تیکھا پن نہیں ہے۔ محاورے کے برمحل استعمال پر انہیں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ چند برس پیشتر انتقال فرمایا۔

www.taemeernews.com

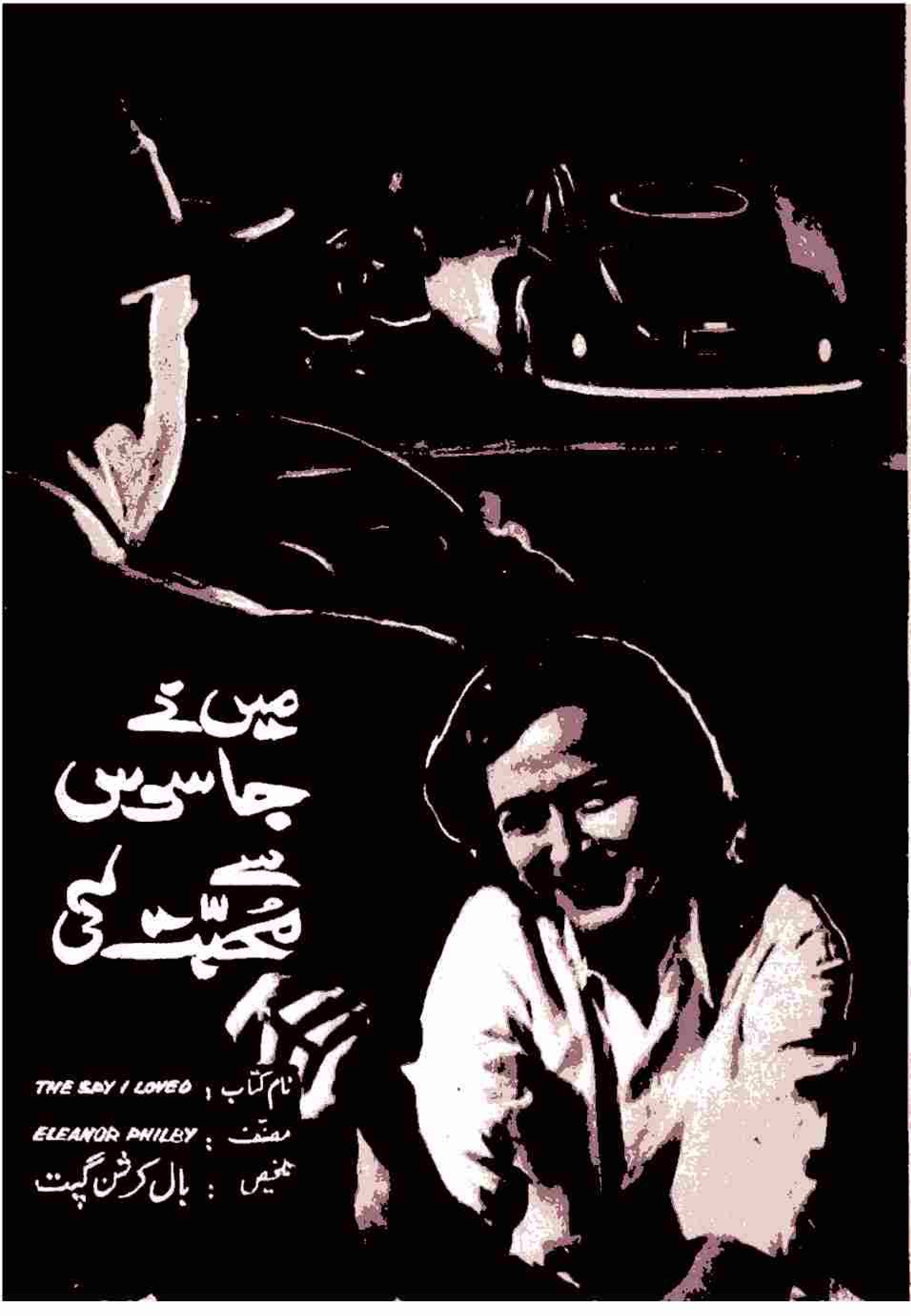

www.taemeernews.com

"کم فلبے" ایک برطانوی جاسوس تھا لیکن جب ۱۹۶۳ء میں ایک دن وہ اچانک بیروت سے غائب ہو کر ماسکو پہنچ گیا تو اس کی بیوی حیران رہ گئی۔ بیوی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اس کا شوہر جس سے وہ دیوانہ وار محبت کرتی ہے ڈبل ایجنٹ ہوگا۔ چند دن تک بیروت میں برطانوی افسروں اور ساری دنیا کے اخباری نمائندوں کے سوالوں کا جواب دینے کے بعد وہ ماسکو گئی تاکہ اپنے شوہر سے ملاقات کرے لیکن . . . The Spy I loved میں کم فلبے کی بیوی الینر فلبے نے ایک ایسی تحیر زا داستان بیان کی ہے جس کو پڑھ کر ساری دنیا انگشت بہ دنداں رہ گئی تھی۔ یہ ایک عورت کی سچی محبت کی کہانی بھی ہے اور بین الاقوامی سازشوں اور جاسوسی سرگرمیوں کا ایک انتہائی دلچسپ افسانہ بھی۔ اس ماہ اس کی دوسری اور آخری قسط شائع کی جا رہی ہے۔
"کم فلبے" یقیناً روس کے اہم ترین جاسوسوں میں سے ایک تھا جو مغربی ممالک میں تعینات ہیں۔ وہ برطانوی جاسوس بھی تھا اور روسی ایجنٹ بھی۔ بائیس سال کی عمر میں وہ جرمن زبان سیکھنے کے لئے آسٹریا گیا جہاں اس نے فروری ۱۹۳۴ء میں کمیونسٹ کارکنوں کا قتلِ عام دیکھا اور اسے کمیونزم سے ہمدردی ہو گئی اور وہیں اسے روس نے اپنا جاسوس بنا لیا۔ لندن واپس آنے پر اس نے اپنی اصلیت چھپانے کے لئے خود کو نازی جرمنی کا ہمدرد ظاہر کیا اور اس طرح جرمنی آتا جاتا رہا۔ اسی اثناء میں اسے برطانوی محکمۂ جاسوسی میں ملازمت مل گئی۔ ۱۹۳۶ء میں وہ اسپین کی خانہ جنگی پر رپورٹ لینے کے لئے اسپین گیا اور جنرل فرانکو کے کیمپ میں رہ کر روسیوں کو تمام خبریں بھیجتا رہا۔ دوسری جنگِ عظیم میں اسے بڑا عہدہ ملا اور اس کے کام کا دائرہ زیادہ وسیع ہو گیا۔ جنگ کے دوران ہی اس نے ایک انگریز عورت سے شادی کی جس سے اس کے پانچ بچے ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں اسے برطانوی انٹلی جنس کے چیف کی حیثیت سے واشنگٹن بھیجا گیا اور ۱۹۶۳ء میں بیروت — جہاں وہ ایک اخباری نامہ نگار کے روپ میں تھا۔ یہیں الینر فلبے یعنی اس کتاب کی مصنفہ اس کی زندگی میں داخل ہوئی اور یہیں سے وہ روس بھاگا۔

اس کی بیوی اور بچے انگلینڈ میں تھے اور وہ خود شہر سے باہر لبنان کے ایک پہاڑی گاؤں میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسی گھر میں اس کے والد نے بھی ایام جلاوطنی گزارے تھے۔ کم کے پاس کوئی زیادہ روپیہ پیسہ تو تھا نہیں اور یہ طرز رہائش سستا بھی تھا۔

لبنان میں اپنے قیام کے دوران وہ صرف ایک یا دو دفعہ اپنے ڈسپیچ لندن روانہ کرنے کے لئے بیروت آیا۔ پرانے طرز زندگی نے اسے دوسرے صحافیوں کی طرح عیش پسندی سے علیحدہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اس وقت وہ چوالیس برس کا تھا، اوسط وزن اور جھکے ہوئے قد کا مالک۔ اس کا چہرہ خوبصورت دائروں اور لکیروں سے بھرا ہوا تھا اور آنکھیں گہری نیلی تھیں میں سمجھ گیا کہ یہ شخص زمانے کے سرد و گرم دیکھے ہوئے ہے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مجھ پر یہ بھید کھل گیا کہ ہمارے بہت سے دوست اور بہت سی دعائیں مشترک ہیں۔ مثلاً موسیقی سے ہم دونوں کو ہی بڑی رغبت تھی۔ اس کی باتوں کا انداز ایسا تھا کہ بہت جلد لوگوں میں گھل مل جائے۔ اس کے اطوار بہت دل خوش کن تھے۔ اسی وجہ سے میں اس کے قریب کھنچتی چلی گئی۔

ہم نے اسے ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی۔ جب بھی وہ شہر آتا، ہمیں ضرور ملتا۔ جلد ہی وہ ہمارا گہرا دوست بن گیا۔ ہم نے کرسمس کے روز اسے اپنے ساتھ ٹھہرنے کی دعوت دی۔ اس

www.taemeernews.com

اخباری نمائندوں اور فوٹوگرافروں کی ایک فوج ظفر موج جمع تھی۔ جہاز کے کپتان نے بھی یہ سب منظر دیکھا اور میری گھبراہٹ کا نظارہ بھی کیا اس کے بعد وہ میرے پاس آکر کہنے لگا: "آپ گھبرائیے نہیں آرام سے بیٹھی رہئے۔ جب دوسرے مسافر اتر جائیں گے تو آپ کی واپسی کا بندوبست بھی کر دیا جائے گا۔۔۔ میں طیارے میں بیٹھی رہی۔ کم کے بیٹے اور بیٹی کو لینے کے لئے اس کے رشتہ دار آئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں لے کر چلے گئے۔ برطانوی خفیہ پولیس کی گاڑی میری درخواست پر مجھے لینے آگئی تھی۔ میں اس میں بیٹھی اور اخبار نویسوں کی عقابی نگاہوں سے بچ کر نکل گئی۔ اس گاڑی نے مجھے کم کی بہن پارٹشیا کے گھر پہنچا دیا۔ پارٹشیا نے مجھے اپنے گھر ٹھہرانے کی پیش کش کی تھی کیوں کہ اس کے ہاں ٹھہرنے سے اخباری نمائندوں سے میری جان محفوظ رہ سکتی تھی۔

جون کی پہلی تاریخ لندن میں اس حیثیت سے میرے لئے پہلا دن تھا۔ میں صبح ذرا دیر سے سو کر اٹھی۔ میں نے اپنے دائیں پاؤں میں بڑا درد محسوس کیا۔ میں اس پر زور نہیں دے سکتی تھی اس پر میں نے "وائی" کو ٹیلی فون کیا۔ تاکہ اس سے کسی ڈاکٹر کے بارے میں معلوم کر سکوں۔ اس نے ڈاکٹر "ای" کا نام تجویز کیا۔ وہ ڈاکٹر میرے پاس آیا۔ اس نے تشخیص کی کہ یہ گھٹیا ہے۔ اس نے مجھے چلنے پھرنے سے منع کیا اور کہنے لگا کہ کئی دنوں تک مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ بہر حال ایک دو دن بعد میں چھڑی کے سہارے چلنے لگی ایک دن پارٹشیا نے "کیو گارڈن" چلنے اور سیر کرنے کو کہا۔ میں رضامند ہوگئی۔ ہم نے ایک باتھ چیئر کرائے پر لی۔ میں اس میں سوار ہوگئی۔ پارٹشیا بے چاری کمال محبت و شفقت اور مہربانی کے ساتھ اسے دھکیل کر باغ تک لے گئی۔

چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہی میں وائی کے گھر گئی اور ان کے ہاں ظہرانہ کھایا۔ اس نے اس عام اڑی ہوئی افواہ کو ایک مصدقہ خبر کے لہجے میں بتایا کہ کم روسی ایجنٹ تھا۔ وائی نے مجھے ہدایت کی کہ میں کبھی ماسکو کا رخ نہ کروں لیکن مجھے ابھی تک اس پر یقین نہیں تھا کہ وہ ماسکو میں ہے۔ اس پر وائی نے تجویز کیا کہ میں اس کے افسر اعلیٰ سے مل لوں جو مجھے روس کے لئے کم کی جاسوسی کی پوری داستان سے آگاہ کرے گا۔ میں رضامند ہوگئی۔ وائی نے اسی وقت فون پر رابطہ قائم کیا۔ چیف مجھے ملنے کے لئے تیار تھا۔

چیف کھانے کے بعد آیا۔ اسکے آنے کے بعد وائی اٹھ کر چلا گیا۔ میں اور وہ ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھے ہوئے تھے۔ کافی کی پیالیاں اور برانڈی کی بوتل ہمارے سامنے رکھی ہوئی تھی میں نے اپنے خیالات کو بڑی شد و مد کے ساتھ اس کے سامنے پیش کیا۔ میرا کہنا تھا کہ کم کس طرح جاسوسی کا یہ کاروبار پھیلا سکتا تھا؟ جب کہ میں جو اس کی تنہائیوں کی ساتھی تھی اس بات سے قطعی طور پر آگاہ نہیں تھی۔ میرے خیال میں اسے اغوا کیا گیا تھا لیکن چیف اپنی بات پر ڈٹا ہوا تھا اس کا کہنا تھا "یہ سب ہم گزشتہ نو برس سے جانتے ہیں۔ کم روس کے لئے بلا معاوضہ کام کرتا رہا ہے۔ سہ پہر ہو چکی تھی۔ شام اپنا سایہ پھیلانے کے لئے بڑھ رہی تھی مگر ہماری گفتگو جاری تھی۔ آخر میری آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا۔ میں اپنی خواہشات کے برعکس اسی طرح سوچ رہی تھی چیف کی باتیں اثر کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ میرے دل میں رہ رہ کر خیال ابھر رہا تھا "اچھا تو میرا محبوب روس کا جاسوس تھا"۔

یہاں بھی مجھے ان ہی دشواریوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا جو بیروت میں میرا مقدر بن چکی تھیں۔ دس دن ہی گزرے تھے کہ اخباری نمائندوں نے میرا پتہ چلا لیا۔ دروازے پر دستک ہوتی تو کوئی اخباری نمائندہ برآمد ہوتا۔ ڈاک آتی تو کسی نہ کسی اخبار کی طرف سے پیش کش پر مبنی خط ہوتا کہ اگر میں اپنی کہانی شائع کرانے کے لئے تیار ہو جاؤں تو خطیر معاوضہ دیا جائے گا۔ ایک

www.taemeernews.com

معروف ہفتہ وار اخبار نے تو مجھے دس ہزار پاؤنڈ کی پیش کش کر دی مجھے یہ معلوم کر کے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ تو اس رقم کے آدھے سے بھی کم ہے جو مس کرسٹائن کیلر کو اس کی یادداشت کے لئے پیش کی گئی۔ تاہم مجھے مسرت ہے کہ پروفیومو کے قصے نے جو ان ہی دنوں چل رہا تھا میری جانب سے توجہ ہٹانے میں بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔ اور زیادہ تر اخباری نمائندے اسی چکر میں پھنس کر رہ گئے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی سارا دن ہی بجتی رہتی لیکن میں نے غیر متعلقہ اصحاب کے ٹیلی فونوں سے چھٹکارا حاصل کرنے اور اپنے دوستوں کو پہچاننے کے لئے چند خفیہ اشارے ایجاد کر لئے۔ اگر فون ان کے مطابق ہوتا تو میں بات کر لیتی۔ وگرنہ ٹال دیتی۔

تاہم اخباری نمائندوں نے مکمل طور پر میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ ایک شام میں اور پارٹشیا سینما دیکھنے گئیں۔ واپسی پر پارٹشیا سینما کے عقبی دروازے سے نکل کر ٹیکسی لینے گئی۔ لیکن جوں ہی ہم باہر نکلیں۔ فوٹوگرافروں کے کیمرے ہمارا تعاقب کر رہے تھے۔ خوش قسمتی سے سینما کا مالک ایک مہذب اور ہمدرد آدمی تھا۔ اس نے ان عکاسوں کو سینما کے احاطہ میں اپنے فن کے جوہر دکھلانے سے منع کر دیا۔ وگرنہ میری تصویر ہر روز اخبارات کے صفحۂ اول پر شائع ہوتی۔

ڈاکٹر بی نے میرے لئے لیبریم کی گولیاں تجویز کی تھیں۔ میں ہر ہفتے اس کے پاس جاتی تھی۔ اس کے سوال و جواب اور باتوں کے انداز نے مجھے اس شبہ میں گرفتار کر دیا کہ ہو نہ ہو اس کا بھی خفیہ پولیس سے کوئی تعلق ضرور ہے۔ تین سال بعد جب میں ماسکو میں تھی۔ تو میں نے یہ خبر بڑی دلچسپی اور غور سے پڑھی تھی کہ گرالوائل واٹنی کا برطانیہ واپسی پر اسی ڈاکٹر نے طبی معائنہ کیا تھا۔

ایک تو یہ سب ہنگامے تھے۔ دوسری طرف مجھے کم کے پیغام کا انتظار تھا۔ لیکن اس طرف سے تو معاملات مکمل سکوت کا شکار ہو گئے معلوم ہوتے تھے۔ ابھی تک کوئی بھی پیغام نہیں آیا تھا یہ صورت حال بڑی اضطراب انگیز تھی۔ مجھے اس بات کا یقین سا تھا کہ اسے معلوم ہوگا کہ میں اس کی بہن کے پاس رہ رہی ہوں پھر اس کے پاس سان فرانسسکو میں میرے بینکر اور لندن میں مشیر قانونی کے پتے بھی تھے اس کے لئے میرے پاس کوئی پیغام پہنچانا نسبتاً آسان تھا میرے پاس اس تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ جب کہ اس کے پاس یہ تین طریقے تھے میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں روسی سفارت خانے سے رابطہ قائم کروں لیکن اس کے نتائج کا خیال آتے ہی جی گھبرا گیا۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا۔

برطانوی اخبار اور پارلیمان کے ارکان کم کے معاملہ پر بحث و تمحیص میں مصروف رہے سرکاری طور پر اس خیال کی تصدیق ۳۱ جولائی ۱۹۶۳ء کو لارڈ پریوی کونسل لارڈ ہیتھ نے یہ کہہ کر کر دی کہ برطانوی محکمہ سراغ رسانی حتمی طور پر یہ بات کہہ سکتا ہے کہ کم کئی سالوں سے روس کا ایجنٹ تھا حکومتی اور مخالف حلقوں میں اس مسئلے پر گرما گرم بحث ہوئی۔ لیکن پھر ماسکو سے ایک اعلان نے اس بحث و تمحیص کا مکمل خاتمہ کر دیا۔ ۳۰ جولائی کو صبح سویرے میں نے بی بی سی سے خبریں سنیں جن میں بتایا گیا کہ "ازوستیا" نے اطلاع دی ہے کہ کم نے روسی شہریت اور روس میں پناہ کی درخواست کی ہے اور سپریم سوویت نے اس کی درخواست منظور کر لی ہے اب مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ روسی ایجنٹ تھا لیکن اس بات پر مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ماسکو گیا ہے۔

برطانوی خفیہ پولیس کا "دائی" دو چیزوں کے بارے میں بڑا متجسس تھا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا میرا کم یا کسی دوسرے روسی سے کوئی رابطہ رہا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ میں

www.taemeernews.com

ماسکو جانا چاہتی ہوں یا نہیں۔ وہ متواتر مجھ پر زور دیتا کہ میں ماسکو جانے کا خیال تک دل سے نکال دوں۔ کیوں کہ اگر میں نے ایسا کیا تو پھر مجھے واپسی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

اس دوران میں نے اپنے سابقہ شوہر سے درخواست کی کہ وہ میری بڑی بیٹی کو برطانیہ آنے کی اجازت دے دے تاکہ وہ کچھ دن میرے اور بچوں کے ساتھ گزار سکے۔ لیکن وہ رضامند نہ ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ اگر میری بیٹی ایک دفعہ میرے پاس پہنچ گئی تو پھر میں اُسے واپس نہیں آنے دوں گی البتہ اس نے مجھے نیویارک تک کا کرایہ ادا کرنے کی پیش کش کر دی۔ تاکہ میں اپنی بیٹی کو آکر دیکھ سکوں۔ میں اس پر رضامند ہوگئی اور اوائل اگست میں نیویارک پرواز کر گئی۔ میری بیٹیا لونگ آئی لینڈ میں میری کزن کے ہاں رہ رہی تھی۔ امریکہ پہنچ کر ایک دو روز تو میں نے گرین چرچ میں اپنے دوستوں اور سہیلیوں کے ساتھ قیام کیا۔ اس کے بعد لونگ آئی لینڈ گئی میں ابھی تک منتظر تھی کہ شائد کم کا کوئی پیغام آہی جائے۔

امید اور انتظار کے اسی عالم میں معجزہ رونما ہوا۔ کم کا خط مجھے ملا۔ یہ خط لندن میں کم کی بہن کی معرفت آیا تھا لیکن وہاں سے امریکہ بھیج دیا گیا۔ مجھے مکمل طور پر اطمینان ہوگیا کہ وہ روس میں ہے اور بالکل بخیر و عافیت۔ اس نے اپنا پتہ بھی تحریر کیا تھا "بکس ۹.D، سینٹرل پوسٹ آفس، ماسکو" اب میں اسے خط لکھ سکتی تھی اس سے مخاطب ہو سکتی تھی۔ آہ میں کتنی خوش نصیب تھی؟ میں اسے روزانہ خط لکھتی لیکن یہ خدشہ بھی میرے ذہن میں رینگتا رہتا کہ ان خطوط کو امریکہ اور روس ہر دو جگہ پر کھول کر پڑھا جاتا ہوگا کم کا خط لمبا تھا۔ اس نے مجھے جلد از جلد ماسکو آنے کا مشورہ دیا تھا اس نے یہ یقین دہانی بھی کرائی تھی کہ اگر میں مستقل طور پر وہاں نہ رہنا چاہوں تو مجھے واپسی کی اجازت ہوگی جس لمحے میں واپس آنے کی خواہش ظاہر کردوں گی۔ اُسی لمحے اسے پورا کرنے کی سعی کی جائے گی۔

اس نے لکھا تھا کہ میں لندن واپس پہنچ کر روسی سفارت خانے سے رابطہ قائم کروں۔ اپنا تعارف کراؤں، وہ لوگ میری ماسکو روانگی کا بندوبست کر دیں گے۔ اس نے یہ اطلاع بھی دی تھی کہ سفارت خانے سے مجھے اتنی رقم بھی دی جائے گی جس سے میں گرم کپڑے خرید سکوں۔ کم نے گرم کپڑوں کی افادیت واضح کرنے کے لئے روس کی سردی کا بڑا تفصیلی نقشہ کھینچ کر رکھ دیا تھا لیکن اس نے ماسکو میں اپنی زندگی کے روز و شب کے بارے میں مجھے بہت کم معلومات بہم پہنچائی تھیں، اس کے خط کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"یہ میرا پہلا براہِ راست خط ہے جو میں تمہیں لکھ رہا ہوں، میں تم سے ملنے کے لئے بہت بے چین ہوں۔ گھبراؤ مت۔ ہماری مشترکہ پریشانیوں کے خاتمے کے دن بہت قریب آگئے ہیں۔"

میں نے اُسے جواب میں دو خط لکھے۔ دو ہفتے بعد اس کا ایک طویل خط آیا جس میں اُس نے لکھا تھا "تم اپنا آپریشن لندن جا کر نہ کراؤ بلکہ یہاں ماسکو آجاؤ جہاں تمہارا آپریشن بالکل مفت میں ہو جائے گا۔ تم اگر چاہو تو لندن سے ڈائریکٹ پہنچ جاؤ وہاں سے تمہارے ماسکو آنے کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں بچوں کے مستقبل کی طرف سے مطمئن نہیں۔ وہ جب چاہیں ماسکو آسکتے ہیں۔ یہاں میرے دوستوں نے میری بڑی مدد کی ہے۔ میرے فلیٹ میں زندگی کے آرام کا ہر سامان موجود ہے۔ بس تم جلدی سے آجاؤ۔" ستمبر ۱۹۶۳ میں مجھے اس کا ایک اور خط ملا جس میں اُس نے لکھا تھا "تم مزید وقت برباد نہ کرو اور لندن میں روسی قونصل سے ملاقات

www.taemeernews.com

کرلو۔ وہ تمہارے ماسکو جانے کا پورا انتظام کردے گا۔"

۱۸ ستمبر کو میں لندن پہنچ گئی کیوں کہ میں ماسکو جانے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ میں نے برطانوی خفیہ پولس کے مسٹر وائی کو بھی جو کِم کا دوست رہ چکا تھا اپنے فیصلے سے مطلع کردیا تھا ۲۳ ستمبر کو مجھے کِم فلبی کا ایک تار ملا۔ جس میں لکھا تھا "سارے انتظام مکمل ہو چکے ہیں فوراً روسی قونصل سے ملاقات کرلو میں تمہیں یہ تار لندن ہی سے بھجوا رہا ہوں۔" دوسرے دن مجھے اس کا تفصیلی خط بھی مل گیا۔ اور ۲۵ ستمبر کو میں خفیہ طور پر روسی قونصل سے ملنے کے لئے روانہ ہوگئی۔

میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو اس ملاقات کا حال معلوم ہو۔ روسی قونصل مجھ سے بڑی گرم جوشی سے ملا اور اُس نے مجھ سے کہا کہ میں ۲۷ ستمبر کو ماسکو جانے کے لئے لندن کے ہوائی اڈے پہنچ جاؤں۔ اُس نے مجھے ضروری خریداری کے لئے پانچ سو پونڈ کے نوٹ بھی دیئے اور کہا "ہوائی اڈے پر میرا آدمی موجود ہوگا اور اس کے پاس آپ کا ہوائی ٹکٹ بھی ہوگا۔"

برطانوی حکام میرے پروگرام سے واقف تھے۔ ۲۷ ستمبر کو میں دس بج کر چالیس منٹ پر ہوائی اڈے پہنچ گئی۔ ایک روسی میری طرف بڑھا اُس نے میرا سامان سنبھالا اور کہا کہ میں بار میں بیٹھ جاؤں اور اخبار والوں کی نگاہوں سے دور رہوں۔

پندرہ منٹ بعد وہ میرے سامان کی رسید لے کر آگیا اور اُس نے مجھے ہوائی جہاز پر سوار کرادیا۔ وہ اس وقت تک جہاز میں موجود رہا جب تک کہ ہوائی جہاز کا انجن اسٹارٹ نہ ہوگیا۔

اور اب میں ماسکو جارہی تھی اپنے کِم کے پاس، اپنے محبوب کے پاس، اپنے شوہر کے پاس۔

لندن سے روانگی کے ٹھیک چار گھنٹے بعد ہوائی اڈے کے باہر میرے کانوں میں ایک عرصہ کے بعد کِم کی آواز پہنچی "ایلینر۔ کیا تم آگئیں۔" اور میں اس سے لپٹ گئی۔ کِم کی تندرستی اچھی ہوگئی تھی۔ خلافِ معمول وہ اس وقت ٹوپی پہنے تھا۔ موٹر میں ایک اور روسی بھی موجود تھا جس کا نام سرگئی تھا یہ ماسکو میں کِم کے معاملات کا نگران تھا اور بعد کے تجربوں نے مجھے بتایا کہ بڑا شریف آدمی تھا۔ کِم کے فلیٹ پہنچنے پر اس نے میرے لئے برانڈی کا ایک جام بنایا اور بڑی تہذیب کے ساتھ میری خدمت میں پیش کیا

کِم ماسکو کے مضافات میں ایک نقلی نام سے رہتا تھا اس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اس کا اصلی نام اور پتہ کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ کِم کا فلیٹ بڑا شاندار تھا اس میں آسائش کا ہر سامان موجود تھا اور مجھے اس میں کافی آرام ملا تھا۔

یہ فلیٹ ہر قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ کِم کے لئے روسیوں نے خاص طور سے قیمتی فرنیچر بنوایا تھا ورنہ روس میں عام طور سے صرف لکڑی کا فرنیچر بنایا جاتا ہے اور وہ بھی بالکل معمولی۔ کِم کے لئے روسی حکام نے ایک ٹیلی ویژن کا بھی بندوبست کردیا تھا تاکہ وہ اپنا دل بہلاتا رہے۔

کِم کے اس فلیٹ پر روسیوں نے ہزاروں روبل خرچ کردیئے تھے۔ صرف ایک کمرے میں کِم کے مطالعے کے لئے چار ہزار کتابیں رکھی گئی تھیں یہ اور بات ہے کہ

www.taemeernews.com

کم نے ان میں سے بہت کم کا مطالعہ کیا تھا۔

ابھی رہائش کے چند ہی دن بعد میں نے محسوس کیا کہ اس فلیٹ میں ہم دونوں کے علاوہ، ایک تیسرا فرد بھی موجود ہے اور یہ ایک عورت ہے یہ عورت ہماری ملازمہ بھی تھی اور ہمارے سارے گھریلو معاملات کی نگران بھی تھی۔ میں نے کم سے جب اس عورت کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا" اس کا نام زینا ہے۔ یہی عورت روس کے قیام کے دوران میرا دردِ سر ثابت ہوئی۔

زینا مضبوط جسم، گھونگریالے بالوں والی ایک پستہ قد خاتون تھی۔ اس کی عمر یہی کوئی تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ ویسے بھی پرکشش اور دل کش۔ وہ صبح آٹھ بجے سے لے کر شام چار بجے تک ہماری زندگیوں کا جز ولاینفک بن کر رہتی۔ وہ کئی ہفتے تک کم کی دیکھ بھال کرتی رہی تھی۔ اور گھرداری کو اپنے مخصوص طریقے پر چلاتی رہی تھی۔ اب اس نے میری طرف سے کسی تبدیلی کو خوش آمدید کہنے کی بجائے واضح طور بتا دیا کہ وہ ان طریقوں میں کوئی تبدیلی پسند نہیں کرے گی۔ وہ تو میری افسر بن گئی تھی۔ اور مجھے اپنا محکوم خیال کرتی تھی۔ اگر میں کسی روز فیصلہ کرتی کہ دروازوں اور فرش کو اچھی طرح صفائی کرکے ان پر رنگ و روغن کیا جائے۔ لیکن اسے یہ بات پسند نہ آئی وہ ناک بھوں چڑھا کر میری تجویز مسترد کر دیتی۔ اور میں چپکی بیٹھی رہتی۔ کبھی کبھار تو وہ ہمارے "لونگ روم" میں بے کار گھنٹوں بیٹھی رہتی۔ اور ہمارے سگرٹوں کے پیکٹ پھونک ڈالتی۔ آلتی پالتی مار کر یہ محترمہ دھواں اڑانے کے سوا کچھ نہ کرتیں۔ اور میں بور ہو جاتی۔

مجھے تو اس وقت روسی زبان کا ایک لفظ بھی بولنا نہیں آتا تھا، خود کم کو بھی اس وقت تک بہت کم روسی آتی تھی۔ لیکن وہ اپنا مدعا لکھ کر بیان کر سکتا ہے۔ لیکن اس زبان کے تفاوت کے علاوہ بھی زینا اور میں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ جس چیز نے سب سے پہلے اس کے خلاف نفرت کا جذبہ میرے دل میں ابھارا وہ یہی تھی کہ وہ ہر روز دوپہر کے وقت کھانے کے لئے میز پر موجود رہا کرتی تھی۔ اور بیٹھتی بھی میرے اور کم کے درمیان تھی۔ میں سوچتی یہ موٹا سا سرہم دونوں کے درمیان حائل کیوں ہو رہا ہے۔

"کیا یہ محترمہ روزانہ ہی ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمایا کریں گی؟" میں نے کم سے سوال کیا مگر وہ چپکا رہا۔ ایک دن میں نے زینا کو ٹماٹر کی چٹنی کی دو بوتلیں لینے کے لئے بھیجا۔ لیکن وہ ایک درجن بوتلیں اٹھا لائی میں بڑی حیران ہوئی اور غصہ بھی آیا میں نے پوچھا یہ بوتلیں کیا ہم سر پہ ماریں گے؟" لیکن زینا کا جواب بھی حیران کن تھا؛ اس نے کہا، پھر جانے یہ چٹنی کب بازار میں آئے؟ اس لئے میں اتنی ڈھیر ساری بوتلیں اٹھا لائی ہوں کہ اچھا خاصا اسٹاک ہو جائے اور ہمیں مہینوں اس کی ضرورت نہ پڑے۔

میرے ماسکو پہنچنے کے بعد روسیوں نے سب سے پہلے خیر مقدمی اقدام یہی کیا کہ کم کو ایک سرکاری کلینک میں میرا اور اپنا طبی معائنہ کرانے کے لئے کہا گیا۔ اس کلینک میں ہمارا سارا دن ضائع کر دیا گیا۔ طرح طرح کے ایکسرے، خون کا ٹیسٹ کرنا اور اس طرح کے دوسرے الابلا مراحل ہماری بوریت کا باعث بنتے رہے۔ میری تو گلو خلاصی ہوئی اور مجھے صحت مند قرار دے دیا گیا۔ البتہ اتنا ضرور کہا گیا کہ مجھے ایک چھوٹے سے آپریشن کی ضرورت ہے لیکن کم کو توانائی بخشنے کے لئے انجکشن تجویز کئے گئے تھے۔

www.taemeernews.com

روزانہ صبح ایک نرس آتی اور ٹیکہ لگاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ ہم کسی اچھے ریسٹ ہاؤس میں کم سے کم ایک ماہ قیام کریں۔ ہم نے اس تجویز کا جواب فوری طور پر دینے کی بجائے اتنا کہا کہ اس پر غور کیا جائے گا۔ ہم دراصل روزمرہ زندگی کی گہما گہمیوں کی طرف لوٹنا چاہتے تھے اور ایک پرسکون گھریلو زندگی کے خواہشمند تھے۔ جس میں کسی قسم کا تکلف وتصنع نہ ہو۔

کم روسی وردی میں ملبوس ایک جاسوس ہی نظر آتا تھا۔ اس کی شکل کچھ عجیب پراسرار بن گئی تھی۔ لیکن جسمانی طور پر وہ زیادہ صحت مند تھا۔ بیروت کے آخری ایام میں اسے جس قدر کرب اور بے چینی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کا اثر ابھی تک اس پر باقی تھا وہ بیروت سے فرار بھی ہوا؟ اس بارے میں اس نے مجھے بہت کم باتیں بتائیں تفصیلی طور پر تمام واقعات مجھے بتانے کی اس نے شاید ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ اسے بہت کچھ پیدل چلنا پڑا ہوگا۔ اگرچہ وہ بیروت سے تو جنوری ۱۹۶۳ء میں ہی فرار ہو گیا تھا۔ لیکن اسے ماسکو پہنچے صرف چند ماہ ہی ہوتے تھے۔ اس نے مجھے کبھی نہ بتایا کہ یہ درمیانی عرصہ اس نے کیسے اور کہاں گزارا۔

ماسکو پہنچ کر وہ دریا کے پار ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہنے لگا ایک موٹی بڈھی اس کے گھربار کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ اس کے لئے کھانا تیار کیا کرتی تھی۔ کم نے بتایا کہ اس موٹی بڈھی کو کبھی میری خوراک کا صحیح اندازہ نہ ہو سکا عموماً یہ چار آدمیوں کا کھانا تیار کر لیا کرتی تھی۔ اس وقت کم اپنا زیادہ وقت روسی خفیہ پولیس کے افسروں کے ساتھ بحث ومباحثہ میں گزارتا اور جو وقت باقی بچتا اسے گھومنے پھرنے میں گزار دیتا۔ وہ ایک نئے شہر کے در و دیوار سے آشنائی پیدا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک پراسرار ایجنٹ کی طرح مختلف جگہوں اور مقامات کو دیکھتا اور پھر ان کی ساری تفصیلات اور جزئیات کو اپنے دماغ میں محفوظ کر لیتا تھا۔

نامعلوم وجوہات کی بنا پر روسی میزبانوں نے ہمیں سخت نگرانی میں رکھا۔ گے برگس، کم کا ندیم دوست اور ہمدرد میری آمد سے کچھ مہینے پہلے ماسکو کے ہسپتال میں انتقال کر چکا تھا۔ اس کی آخری رسومات میں کم کو شرکت کی اجازت نہیں دی گئی تھی۔ کم نے ہسپتال میں اس کی میت دیکھ لی تھی اور میں بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ گے نے بھی روسی حکام کی طرف سے عائد شدہ پابندی تسلیم نہیں کیں نہ ہی اس نے الگ تھلگ زندگی گزاری — مجھے اس بات پر بھی تعجب ہوا کہ اس نے کبھی روسی زبان سیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔

روسی زندگی کی نوکر شاہیت نے اسے خاصہ صدمہ پہنچایا۔ وہ موسیقی فلموں اور کتابوں کا شائق تھا جی کھول کر پینا اور بحث ومباحثہ کرنا اس کے لئے پسندیدہ کام تھا۔ مرنے کے ایک سال پیشتر اس نے انگلینڈ جانے کی تمنا کی تھی۔ اس مقصد کے لئے وہ روسی اور برطانوی ہر دو حکام سے بحث وتمحیص میں مصروف رہا تھا۔ روس کو تو اس کو اجازت دینے سے کوئی عار نہیں تھا، بلکہ شاید یہاں کے حکام تو اس سے چھٹکارا ہی پانا چاہتے تھے۔ لیکن برطانیہ نے اسے اپنی حدود میں داخلے کی اجازت نہیں دی۔ اور اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ انتقال کر گیا۔ اس کی میت کے پھول اب ولیسٹ لیون، ہیمپ شائر (برطانیہ) کے گرجے میں رکھے ہوئے ہیں جو برگس خاندان کا آبائی وطن

www.taemeernews.com

ہے۔

برگس اپنے کپڑے اور کتابیں کم کو دے گیا تھا کم کو ایک خوبصورت میز بھی ملی جو دراصل برگس کی والدہ کی تھی۔ یہ اگرچہ میرے فلیٹ میں پڑی ہوئی تھی۔ لیکن کچھ ٹوٹ سی گئی تھی مجھے اس کی مرمت کرنے والا کوئی نہیں مل رہا تھا۔

کم نے میرے پہنچنے کے ایک دن بعد ہی مجھ سے کہا: "تم زینا کے ساتھ برگس کے فلیٹ میں چلی جاؤ۔ اور اگر کوئی اور قابل استعمال چیز ملے تو اسے لیتی آؤ۔" اس وقت جانے سے ہچکچائی تو بہی لیکن مجھے ایسا کرنا پڑا۔ اور تھوڑا بہت ضروری سامان وہاں سے لے آئی۔

ماسکو پہنچنے کے پہلے ہفتے کے دوران میں اور کم لگاتار بولتے رہے قریباً تمام دن اور رات، ہم اپنے اوپر بیتے ہوئے تمام باتوں اور حادثات سے ایک دوسرے کو جلد از جلد مطلع کرنا چاہتے تھے۔ کم اپنے بچوں کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور اس دوران میری مصروفیات اور مشکلات کے بارے میں بھی ہر قسم کی بات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ہم دونوں زمانۂ ماضی کی یاد تازہ کر کے، پرانے زمانے میں پھر واپس جاتے اور خیالوں میں پھر وہی دنیا بساتے جب ہم بیروت میں رہتے تھے اس وقت دن کتنے حسین اور راتیں کتنی خوبصورت ہوا کرتی تھیں۔ آج مجھے اندازہ ہوتا ہے اور میں واقعہ کے اس رخ پر غور کرتی ہوں تو متعجب سا ہوتا ہے کہ کس طرح کم نے میرے مونہہ سے تو سب ضروری باتیں اگلوا لیں۔ لیکن خود اپنے بارے میں ایک لفظ بھی نہ بتایا۔

ماسکو میں کم سے مل کر مجھے یہی احساس ہوا کہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، وہ وہی کم تھا، محبت سے بھرپور، پرکشش، جذباتی اور مجھ میں کھو جانے والا کم، میرا کم۔ جو جسمانی طور پر تو کمزور ہو گیا تھا۔ لیکن ذہنی اور جذباتی طور پر وہ ویسا ہی تھا۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہم دونوں ماسکو میں رہ کر ایک اور بیروت تعمیر کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لئے جدوجہد کرنے کی خاطر دونوں متحد اور مطمئن تھے۔

پہلا سنجیدہ کام جو مجھ سے سرزد ہوا یہی تھا کہ دونوں نے بڑی محنت سے اکٹھے بیٹھ کر اس روئیداد کو قلم بند کیا۔ اس سلوک کو تحریر کا جامہ پہنایا جو برطانوی اور امریکی خفیہ پولیس نے میرے ساتھ روا رکھا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ کم مجھ سے یہ سب کچھ اس لئے کروا رہا ہے کہ اس کے روسی دوستوں کو ان اطلاعات کی ضرورت ہے کم مجھے ان تفصیلات کو بار بار دہرانے کے لئے کہتا، وہ روزانہ مجھ سے سنتا اور روزانہ ہی پھر اس کا تذکرہ لے کر بیٹھ جاتا۔ حتیٰ کہ میں اس تکرار سے تنگ آگئی لیکن کم کے بور ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ پھر مجھ سے انہیں دہرانے کے لئے کہتا۔ مجھے معلوم ہوا کہ "دوائی" ہی وہ واحد آدمی تھا جس کو کم کے روسیوں سے رابطے اور تعلقات کے بارے میں کچھ علم ہو گیا تھا لیکن وہ اس حسن ظن میں مارا گیا کہ یہ روس کے سربستہ رازوں کو برطانیہ کے لئے فاش کرنے کی غرض سے مصروف جہد ہے۔ وہ اسے روسیوں کے خلاف استعمال کرنے کے لئے ابھارتا رہا۔ کم نے "دوائی" کو مزید دھوکہ دینے کے لئے اسے کچھ اطلاعات بہم پہنچائیں۔ لیکن یہ تمام معلومات بے فائدہ تھیں اور کسی قسم قدر و قیمت سے عاری ایک دن کم نے فخر کے ساتھ کہا کہ میں روس کے لئے تیس سال تک کام کرتا رہا ہوں تیس

www.taemeernews.com

سال تک ۔ یہ صرف سات سال کی بات نہیں ہے جیسا کہ برطانوی خفیہ پولیس کا کہنا ہے۔"

بہت سے دن بحث و مباحثے اور گفتگوؤں کی نذر کرنے کے بعد میں نے ایک دن کم سے پوچھا "تمہاری زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت کس بات کو حاصل ہے؟ میں تمہارے بچے یا کمیونسٹ پارٹی؟ - سچ سچ بتاؤ۔ تمہارے دل میں سب سے زیادہ کس کی محبت رچی بسی ہے۔" اس نے ایک لمحے کی پس و پیش اور ہچکچاہٹ کے بغیر فوری طور پر بڑے باعتماد لہجے میں جواب دیا: "کمیونسٹ پارٹی کو۔" اس جواب کو سن کے میں خود کو بے وقوف محسوس کرنے لگی۔ میں پچھتائی کہ میں نے ایسا سوال ہی کیوں کیا تھا۔ میں اس سے پہلے کبھی کسی راسخ العقیدہ کمیونسٹ سے نہیں ملی تھی۔ کم نے کبھی اپنے سیاسی رجحانات کو زبان عطا نہیں کی تھی اور میں یہ ہی سمجھے ہوئے تھی کہ ہم دونوں یکساں نظریات اور احساسات کے مالک ہیں۔ ہماری گفتگو کا محور روزمرہ کی زندگی کی مصروفیات ہی رہتیں۔ نظریاتی سوالات اور موضوعات پر وہ کوئی زیادہ گفتگو نہ کرتا تھا۔ اس لئے اس کے اس جواب پر میں ایک عجیب سی کیفیت میں ڈوب گئی تھی۔ میں نے بڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اسے جواب دیا "تمہیں ایک کمیونسٹ خاتون ہی سے شادی کرنی چاہئے تھی۔ ایک راسخ العقیدہ اور کٹر کمیونسٹ سے کسی دوسرے سے شادی کرنے کا خیال ہی دل میں نہیں لانا چاہئے تھا۔"

اس نے جواب دیا "تمہارا کہنا حرف بحرف صحیح ہے۔ تم بالکل ٹھیک کہتی ہو مجھے تمہاری رائے سے مطلقاً اتفاق ہے۔"

اس گفتگو نے ہمارے تعلقات میں تبدیلی ضرور پیدا کی۔ مجھے ہمیشہ یہ احساس رہا تھا کہ میرے اور کم کے درمیان کوئی چیز خفیہ نہیں ہے۔ میں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے کوئی بات چھپا کر نہیں رکھتے ہم دونوں کے درمیان کوئی "آہنی پردہ" حائل نہیں ہے۔ لیکن میں اب اس احساس کو زندہ نہ رکھ سکی۔ مجھے اعتماد کے ٹوٹنے کا سا احساس ہوا۔ لیکن پھر فوراً ہی میں نے خود کو سمجھایا اور یہ کہہ کر تسلی دی کہ "یہ میرے احساسات تو شروع ہی سے بے بنیاد رہے ہیں اگر ہم دونوں ایک دوسرے سے کوئی چیز چھپا کر نہ رکھنے کے قائل ہوتے تو مجھے کم کی ایک پُراسرار گمشدگی اور پھر ماسکو پہنچنے کے بارے میں تو کچھ علم ہوتا مجھے کبھی اس کی زندگی کے اسرار کے بارے میں واقفیت نہ ہو سکی تھی۔ نہ ہی کبھی اس کے کام کی صحیح نوعیت کا اندازہ ہو سکا تھا اور نہ ہی اس کی تیس سالہ زندگی کی مصروفیت سے آگاہی ہو سکی تھی۔ یہ تمام باتیں میرے لئے ایک معمہ اور اسرار ہی تو تھیں۔ رہیں اور ہیں۔ اس لئے میری سوچ کا یہ اندازہ غلط ہے۔"

میں نہ تو کبھی کمیونسٹ پارٹی کی رکن رہی تھی نہ ہی میرے دل میں کبھی ممبر بننے کی ہلکی سی خواہش بھی پیدا ہوئی تھی۔ لیکن مجھے یہ بھی احساس ہے کہ اگر میں اس ممبر شپ کے لئے درخواست بھی کرتی تو اسے شرف قبولیت حاصل نہ ہوتا۔

آہستہ آہستہ میرے ذہن میں یہ بات راسخ ہوتی گئی اور مجھے یقین سا ہوتا گیا کہ یہ شخص میں جس سے ابھی تک محبت کرتی ہوں جس کی خاطر دنیا سے مونہہ موڑ بیٹھی درحقیقت وہ ایک دھوکہ باز ہے۔

میں اس تاثر کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنا سکتی۔